راحت جبیں

محبت کی کہانیاں

ٹریکٹر کی چابی اس نے اکرم کو تھما کر باقی ماندہ کام سمجھایا اور دوسرے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ جہاں گندم کی کٹائی پورے زور و شور سے جاری تھی۔ جہاں سورج کی تپش میں کمی آ گئی تھی وہیں غریب محنت کش کے ہاتھوں میں تھکن پسینے کی طرح اتر آئی تھی۔ مگر پھر بھی دراتی کی تیز دار جنبش سے گندم کی سنہری بالیاں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ کبھی یونہی کوئی منچلا اونچے سروں میں کوئی لوک گیت چھیڑ دیتا تو بلے اور شاوا کی آوازوں کے ساتھ سب کے ہاتھوں میں مستی اتر آتی۔ ارسلان نے گریبان کے اوپری دو بٹن کھول کر گریبان کو جھٹکتے ہوئے پسینہ خشک کرنے کی کوشش کی۔ مزارعوں کی قمیص پسینے میں بھیگ کر جسموں سے چپک گئی تھیں۔ کئی کسان قمیصیں اتارے ہر قسم کی گرمی سے بے نیاز کام میں مصروف تھے۔

ارسلان جاوید نے رک کر کام کی رفتار کا اندازہ لگایا۔ اور مزید ہدایات دیتا باغ کی طرف نکل آیا۔ یہاں ایک دم سے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ باغ کے عین درمیان سے چھوٹی سی ندی بہتی آ رہی تھی۔ جس نے باغ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ ندی کے کنارے بیٹھ کر قمیص کے بازو چڑھانے لگا۔

"او ارسلان پتر!" باغ کا رکھوالا اسے دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

"السلام علیکم نورے چاچا! کیا حال ہے؟" ارسلان نے ایک لمحے کو رک کر اسے دیکھا۔

"بس پتر! بڑا کرم ہے سوہنے رب کا۔"

"اور اس بار باغ کا کیا حال ہے؟" ارسلان نے ندی کے ٹھنڈے پانی سے دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر منہ پر چھپاکے مارے۔ اور گیلے ہاتھوں سے بالوں میں انگلیاں پھیرتا کھڑا ہو گیا۔ نورے چاچا نے کندھے سے صافہ اتار کر اس کی طرف بڑھایا مگر اس نے منع کر دیا۔

"بڑا کرم ہے۔ دسہری، انور رٹول اور دیسی سب لدے ہوئے ہیں۔ بس لنگڑا مار کھا گیا ہے۔" چاچا نورے نے اپنے مخصوص انداز میں آموں کی

مختلف قسموں کا نام لے کر بتایا تو ارسلان اُس کے ساتھ چلتا ہوا درختوں کا جائزہ لینے لگا۔

"ارسلان باؤ! او ارسلان باؤ!" برکت بڑی دور سے بھاگتا چلا آیا۔

"اور سناؤ چاچا! عمر حیات کا کیا حال ہے؟" ارسلان نے برکت کو — دیکھ کر اُس کے بیٹے کا پوچھا۔

"رب کے فضل سے وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ تجھے بہت یاد کرتا ہے۔ صبح آیا تھا تیری طرف ملا نہیں؟" نورے کے بیٹے عمر حیات اور ارسلان کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔

بس ایک ہی فرق تھا کہ ارسلان مالک اور عمر ملازم کا بیٹا تھا۔ مگر چوہدری جاوید اور ارسلان نے اپنی انسان دوستی کی بنا پر کبھی بھی یہ فرق محسوس نہیں کیا تھا۔ نورا اُن کا بہت پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ اور پھر دوستی کا رشتہ تو ان تمام اونچ نیچ سے بالاتر ہوتا ہے۔

"بس چاچا! میں تو صبح سے ادھر ہوں زمینوں پر۔ شہر سے آتا ہوں تو بہت سے کام منتظر ہوتے ہیں۔" ارسلان برکت کی طرف متوجہ ہوا جو اُن کے قریب آگیا تھا۔

"ارسلان باؤ! شہروں پر رہنے آئے تے؟" (شہر سے مہمان آئے تھے) اُس نے قریب آکر ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا چاچا! پھر میں چلتا ہوں۔" ارسلان نے نورے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ۔ بڑا ہی بی با پتر ہے چودھری جاوید کا۔ شہری باؤ والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ پنڈ آتا ہے تو سارے کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ ابھی کل آیا تھا۔ آج سارا دن زمینوں پر گزرا ہے۔" نورا اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھا کہ ارسلان اُس کی گودوں کھیلا تھا۔

ندی یہاں سے گھوم کر حویلی کے سامنے سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ حویلی کے باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور ندی کے کنارے شہتوت کے درختوں کے نیچے دیسی مرغ ذبح کیے جا رہے تھے۔ وہ ندی کراس کر کے اندر آگیا۔ حویلی کے کھلے صحن میں جھاڑو لگا کر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ دو بڑے بڑے ایئر کولر فضا میں گرمی کے اثرات دور کر رہے تھے۔ آنگن میں چارپائیاں اور کرسیاں بچھی تھیں جن پر بیٹھے مہمانوں کی شربت سے تواضع کی جا رہی تھی۔

"السلام علیکم!" اُس کے خوش دلی سے کیے گئے سلام کے جواب میں خوش گپیوں میں مصروف سب لوگ چونک گئے۔

"السلام علیکم بھائی! آپ کہاں گم تھے؟" لڑکیوں کی چہکتی ہوئی آوازیں۔ وہ خوش دلی سے سلام کا جواب دے کر بڑے اور چھوٹے تایا سے ملنے لگا۔ تقریباً سب ہی لوگ تھے۔ علی، احسن اور زیبا اُس کے بڑے تایا کی اولاد تھے اور اسد، شہلا، فضہ اور حارث چھوٹے تایا کی۔ علی سے ملتے ہوئے وہ بے اختیار چونک گیا۔ جینز پر سفید کڑھائی والے کرتے اور بڑے سے دوپٹے سے ساتھ اپنے گھنگھریالے بالوں کو بینڈ میں جکڑے وہ عین ایئر کولر کے سامنے بیٹھی تھی۔ ہوا کے زور سے گھنگھریالے بالوں کی لٹیں اُس کے چہرے پر بکھرنے لگتیں۔ وہ بکھرتے بالوں اور اڑتے دوپٹے میں اُلجھی ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اُسی کی طرف متوجہ تھی۔ گزرے ماہ و سال بھی اُس کی شبیہہ کو ارسلان کے ذہن و دل میں دھندلا نہ سکے تھے۔ وہ اب بھی اتنی ہی پیاری تھی۔

ماضی کا ایک لمحہ ارسلان کی آنکھوں میں مسکرانے لگا۔ جب چھ سالہ ارسلان نے اُس ننھے سے وجود کو جھولے میں سوتے دیکھ کر اُس کے روئی جیسے گالوں کو چھوا تھا۔

"امی! یہ اتنی سفید کیوں ہے؟"

اس کے معصوم سوال پر امی اور سدرہ چچی ہنس دیں۔

"امی! اسے ہم لے لیں۔" وہ سرخ و سفید سی سیاہ بالوں والی گڑیا اُسے اتنی پیاری لگی تھی کہ وہ اُسے

کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

"لو بھئی سدرہ! تم تو بے فکر ہو جاؤ۔ اب یہ گڑیا ہماری ہے۔ آخر میرے ارسلان نے خود مانگا ہے اسے۔"

امی نے ہنس کر کہا۔ ارسلان اُس کے منے منے ہاتھ چھو کر دیکھنے لگا۔

"تمہاری ہی ہے آپا!"

سدرہ چچی نے خوش دلی سے کہا۔ وہ تو جیسے نہال ہو گیا۔ علی یا احسن میں سے کوئی اُسے اُٹھاتا تو وہ لڑ لڑ پڑتا۔ یہ صرف میری گڑیا ہے۔ اور جب سدرہ چچی کی وفات کے بعد شجاعت چچا نے اپنے ایک جاپانی دوست کے تعاون سے جاپان میں بزنس کشن کمپنی قائم کر لی اور ہمیشہ کے لیے وہاں شفٹ ہو گئے تو وہ سسک سسک کر روتا رہا۔ جاتے وقت سب اُسے بلاتے رہے کہ وہ ایک بار آکر مل لے مگر وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے روتا رہا۔ سب سے خفا ہو گیا کہ ان سب نے اُسے جانے کیوں دیا۔

"ارسلان بھائی! کہاں کھو گئے؟" فضہ کی آواز پر وہ چونک گیا۔

"پہچانا آپ نے؟" شہلا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں پہچان لیا۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے بھرپور نظر اُس پر ڈالی۔ جس کی سفید رنگت میں گلابیاں گھلی تھیں۔ اُس کی آنکھیں اتنی روشن تھیں جیسے بہت سی بجلیاں ایک ساتھ کوندتی ہوں۔ مخروطی انگلیوں والے ہاتھ اب بھی اتنے ہی خوبصورت اور نرم و نازک تھے کہ چھونے سے میلے ہو جانے کا ڈر رہے۔ ناخنوں پر لگی گلابی کیوٹیکس اور نازک سی گولڈن رنگ اُن ہاتھوں کا حسن کچھ اور بڑھا رہی تھی۔

"اور ماہم! آپ نے پہچانا؟" شہلا نے مسکرا کر اُس سے پوچھا۔

"ا۔ ارسلان۔" اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بہت معصومیت سے جھجکتے ہوئے کہا۔ جیسے اپنی پہچان پر شبہ ہو۔ نجانے کیوں ارسلان بجھ سا گیا۔

"بالکل ٹھیک۔ یہ ہیں ہمارے چوہدری ارسلان اپلائیڈ سائیکالوجی میں ماسٹرز کے بعد کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں۔" احسن کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ چونک گیا۔ گو کہ احسن اکثر اُسے چوہدری ارسلان کہہ کر مذاق کیا کرتا تھا مگر کیوں طنز کبھی نہیں کیا تھا۔

"یہ ہل کا نہیں جدید مشینری کا زمانہ ہے۔" ارسلان نے ہنستے ہوئے اُس کا جملہ اڑایا۔

"آپ کو حیرت نہیں ہوئی ماہم؟" احسن نے ماہم سے پوچھا۔

"حیرت کس بات کی؟" اُس نے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے بہت حیرت اور معصومیت سے پوچھا۔ سب ہنس دیے۔

"یار احسن! یہ جس ملک سے آئی ہیں وہاں بڑے بڑے پی ایچ ڈی بھی ایسے کاموں میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔" حارث نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو وہ کھسیانا سا ہو گیا۔

"اچھا چھوڑو۔ تم لوگ بتاؤ میں ابھی کل ہی تو آیا ہوں۔ تم لوگوں نے کل تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا آنے کا۔" ارسلان نے بات پلٹی۔

"کل؟" شہلا نے ناراضگی سے اُس کی طرف دیکھا۔ "گھر سے ہو کر آئے تھے؟"

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ واقعی وہ کل سیدھا اپنے فلیٹ سے گاؤں آگیا تھا۔

"ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے کئی کئی دن نہیں ملتے۔ ہوتے کہاں ہیں آپ آج کل؟" فضہ نے بھی شکایت کی۔

"بس گزر رہا! کچھ مصروفیت ایسی رہی۔ مگر آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" اُس نے پیار سے اُس کے بال بکھیرے۔

"او کے ماہم! آپ لوگ انجوائے کریں۔ میں ذرا باتھ لے لوں۔" اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ تبھی بی بی جان آگئیں۔

"آگئے تم۔ یاد آگیا کہ گھر بھی آتے ہیں۔"

"او بی بی جان! کام بھی تو کرنے ہوتے ہیں۔"
اُس نے اپنا مضبوط بازو اُن کے کندھے کے گرد پھیلایا۔

"ہاں سارے کام تو جیسے تمہارے لیے ہی رکے ہیں۔" وہ بدستور خفا تھیں۔ "نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ دیکھو تو اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔"

ماہم حیرت سے اُس لمبے چوڑے بھرپور نوجوان کا بی بی جان سے لاڈ دیکھ رہی تھی۔ یہ باقی سب سے کتنا مختلف سا ہے۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت گھنی مونچھوں تلے مسکراتے لب۔ فولاد کی ہوئی آستینوں سے جھانکتے مضبوط بازو۔ فراخ پیشانی پر چمکتا پسینہ۔ وہ واقعی اس دھرتی کا بیٹا نظر آ رہا تھا۔

"کیوں بھئی برخوردار! میں نے سنا ہے تم کوئی فیکٹری لگا رہے ہو شہر میں۔"

بڑے تایا اُس سے فیکٹری کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ تو وہ نہانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر کے انہیں فیکٹری کی تفصیلات بتانے لگا۔

رات کے کھانے پر ارسلان کی امی نے خاصا اہتمام کیا۔ بہت سے دیہاتی اور شہری لوازمات سے دستر خوان سجا تھا۔ دیسی گھی میں بھنا مرغ، پلاؤ زردہ، قیمہ بھرے کریلے، ساگ اور کھیر۔ پہلے مردانے میں کھانا بھجوایا گیا۔ پھر بڑے سے ہال کمرے میں دستر خوان بچھا۔

"تائی جان! اتنا کچھ؟" ماہم نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ارے اپنی بیٹی کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ اتنے سالوں کے بعد تو آئی ہو۔" انہوں نے اُس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"سارا دن ہمارے پاس بیٹھیں بھی نہیں۔" ماہم نے شکوہ کیا۔

"اب تو میری بیٹی آ گئی ہے ناں یہاں۔ بس باتیں ہی باتیں ہوں گی۔" انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو وہ سر ہلا کر مسکرا دی۔

"تائی جان! یہ ملازمائیں ہیں۔" ماہم نے دو لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو صبح سے اُن کے ساتھ کام میں لگی تھیں۔ اور سارا دن چپکے چپکے دیکھ کر مسکراتی اور سرگوشیاں کرتی رہی تھیں اور جب وہ انہیں پاس بلاتی تو دوپٹوں میں منہ دے کر ہنستی ہوئی دُور بھاگ جاتیں۔

"ارے نہیں۔ اپنی ہی بچیاں ہیں۔ کام زیادہ ہو تو میں انہیں بلا لیتی ہوں۔ آ جاؤ!"

"رضیہ، کوثر!" تائی جان نے بلایا تو وہ دوبارہ دوپٹوں میں منہ چھپاتی کچن میں جا چھپیں۔ تائی جان انہیں وہیں کھانا دے آئیں۔ کھانے کے بعد جب سب لوگ جانے کو تیار ہوئے تو بی بی جان، ارسلان، اُس کی امی اور بابا حیران ہو گئے۔

"ٹک کر بیٹھ جاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں اس وقت جانے کی۔ غضب خدا کا ایسے کون سے کام پڑے ہیں تم لوگوں کے۔"

بی بی جان سخت غصے میں تھیں مگر سب کے پاس اپنے اپنے جواز تھے۔ آفس کا مسئلہ۔ اسکول۔ کالج وغیرہ وغیرہ۔

"ٹھیک ہے، ماہم کو یہیں چھوڑ جاؤ۔" بی بی جان نے فیصلہ سنایا۔

"کمال کرتی ہیں بی بی جان! بھلا ماہم یہاں کیسے رہ سکے گی۔ اتنی گرمی، مچھر۔" احسن نے منہ بنا کر کہا۔

"مہمان خانے میں اے سی لگا ہے ماہم بیٹا۔ وہاں ٹھہر جانا۔" ارسلان کے ابو نے کہا تو وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ یہاں آنے سے پہلے جو کچھ احسن وغیرہ نے گاؤں کے بارے میں بتایا تھا۔ اُس کی بنا پر یہاں ٹھہرنا واقعی مشکل لگ رہا تھا۔ مگر یہاں کی مہکتی فضا اور سب لوگوں کا پُرخلوص اصرار روک بھی رہا تھا۔

"ہم پھر آ جائیں گے بی بی جان!" اُس نے پیار سے بی بی جان کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"ٹھیک ہے ناں بی بی جان! بھلا شہروں کے لوگ یہاں گاؤں میں کہاں ٹھہر سکیں گے۔" ارسلان کے لہجے میں نجانے کیا تھا وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ شاید ناراض ہو گئے ہیں ارسلان بھائی؟" اس کے چہرے پر ملکوتی سی مسکراہٹ ٹھہری تھی۔

"ارے نہیں۔ میرا مطلب ہے بی بی جان! ماہم پھر آ جائیں گی۔ تین منٹ کی تو ڈرائیو ہے۔ جب دل چاہے آپ مل آئیے گا۔" ارسلان نے اپنے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

"لو ماہم بیٹے! یہ تمہارے لیے ہے۔" ارسلان کی امی نے دو خوبصورت سے سوٹ پیس اُسے تھمائے۔

"یہ کس لیے تائی جان؟" ماہم نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلی بار آئی ہو اپنے ددھیال میں۔"

ذرا سی دیر میں سب مل ملا کر رخصت ہوئے تو ایک بے نام سی اداسی در و دیوار پر چھا گئی۔ بی بی جان اور عذرا بیگم کتنی دیر اُس کی باتیں کرتی رہیں۔

"تو یہ لوٹ ہی آئی۔" ارسلان دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر بستر پر دراز ہوا۔ "مگر یوں کہ ماضی کی کوئی شبیہہ اُس کے ذہن میں نہیں۔ اور میں۔ میں نے ہمیشہ صرف اُسی کا انتظار کیا۔ شاید اس لیے کہ بی بی جان اور امی نے ہمیشہ اُسے اپنی باتوں میں یاد رکھا۔"

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی؟" عذرا بیگم نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر پیار سے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ اور اُن کے ہاتھ سے دودھ پتی کا پیالہ لے لیا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ یونہی بس فیکٹری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"جھوٹ۔" انہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

یہاں آ کر وہ بہت خوش تھی۔ سب لوگ اُسے بھرپور کمپنی دیتے۔ جو کبھی اُداس ہونے بھی لگتی تو وہ لوگ اپنی پُرلطف باتوں سے اُسے ہنسا ہنسا دیتے۔

"ہنستی رہا کریں ناں آپی! آپ کی ہنسی بہت خوبصورت ہے۔"

زیبا اُس کا ہاتھ تھام کر کہتی۔ علی بھائی ہر وقت آفس میں مصروف رہتے۔ احسن اپنی جاب کے باوجود اُس کے لیے وقت نکال لیتا۔ شہلا کے ساتھ تو اُس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اُس کے ساتھ وہ پاکستانی کھانے بنانا سیکھ رہی تھی۔ اسد اسلام آباد میں جاب کرتا تھا۔ کہیں مہینوں بعد شکل دکھاتا۔ فضہ آپی انگلش میں ماسٹرز کر رہی تھیں۔ اُن کی بات اُن کے ماموں زاد سے طے تھی، جو امریکہ میں ایم ایس کر رہے تھے۔ حارث بی اے فائنل ایر اور زیبا تھرڈ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ بڑی سی کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں بڑے تایا اور نیچے چھوٹے تایا مقیم تھے۔ بڑی تائی کے پاس بس ایک ہی موضوع تھا۔ شہلا کا رشتہ۔ شہلا چڑ جاتی۔

"بس امی کا بس نہیں چلتا کہ کسی بھی راہ چلتے کا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُس کے ساتھ رخصت کر دیں۔" وہ دھڑ دھڑاتی نیچے آ جاتی۔ جہاں چھوٹی تائی کو فضہ آپی کے جہیز کی فکر سوار رہتی۔

لاؤنج میں ہنگامہ سا بپا تھا۔ حارث خاصے والیم کے ساتھ کوئی انگلش میوزک سن رہا تھا ساتھ ہی وہ اور زیبا سر جوڑے بجانے کون کون سے سنگرز پر تبصرے کر رہے تھے۔ فضہ آپی وہیں صوفے پر کتابیں پھیلائے نوٹس بنانے میں مصروف تھیں۔ شہلا فیشن میگزینز سے بہار کے نئے فیشن سلیکٹ کر رہی تھی۔ اور ماہم سوچ رہی تھی۔

"میں نے یہاں آ کر غلطی — تو نہیں کی۔ یہاں سب لوگ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مگر پاپا نے ایک بار بھی فون کر کے نہیں پوچھا کہ ماہم تم کیسی ہو؟ تم اداس تو نہیں رہتیں۔ مجھے یاد کرتی ہو کہ نہیں۔"

السلام علیکم کی پُرجوش آواز پر وہ چونک گئی۔

"ارسلان بھائی۔" شہلا اور زیبا سب چھوڑ چھاڑ اُس کی طرف بھاگی تھیں۔

"کتنے بُرے ہیں آپ۔ پتا ہے پورے دو ہفتے بعد شکل دکھائی ہے۔" زیبا کی تو جان اٹکی رہتی تھی اُس میں۔ ارسلان بھائی کا نام ہر دم ورد زبان رہتا۔

"جی ہیں تو جیسے سمندر پار رہتا ہوں۔ خود نہیں آسکتی تھیں۔ یا فون کرتے ہوئے ہاتھ گھستے تھے۔" ارسلان نے اُس کے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ چیخ پڑی۔

"آپ ملتے ہیں فون پر۔ روز بی بی جان اور آنٹی بات کرتی ہیں۔ آپ کا پوچھو تو فوراً جواب ملتا ہے زمینوں پر گیا ہے۔" شہلا نے بھی منہ بنا کر کہا تو وہ ہنس دیا۔

"آپ سنائیں ماہم کیسی ہیں آپ؟" ارسلان نے اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ بی بی جان اور تائی اماں کیسی ہیں؟" ماہم نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ بہت یاد کرتی ہیں آپ کو۔"

ارسلان نے کہا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔ ہر روز بی بی فون کر کے اُسے گاؤں آنے کا کہتیں۔ مگر ہر بار احسن اور حارث مل کر کچھ ایسا پروگرام بناتے کہ گاؤں جانے کا پروگرام اگلے دن پر ڈال دیا جاتا۔ اور یوں پورے دو ہفتے ہوگئے تھے اُسے۔

"ہم آئیں گے کسی روز۔ وہ بس یہ لوگ روز کوئی نہ کوئی پروگرام سیٹ کر لیتے تھے۔" وہ ہم کا صیغہ استعمال کر کے اتنی معصومیت سے بات کرتی کہ سامنے والا بے اختیار مسکرا اٹھتا۔

"بی بی جان کا تو اصرار تھا کہ آپ کو آج ہی گاؤں آنا ہے۔" ارسلان نے بی بی جان کا پیغام دیا۔

"ارے بھئی آج کیسے جا سکتی ہیں۔" احسن نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وہ آخری جملہ سن چکا تھا۔ "آج تو ہمارا پروگرام ماہم کو شاہی قلعہ دکھانے کا ہے۔ شام کو الحمرا میں میوزیکل شو اور اُس کے بعد چائنیز۔" احسن نے پورے دن کا پروگرام ایک پل میں سیٹ کر لیا۔

"بلکہ تم بھی ساتھ چلو۔ ذرا مزا رہے گا۔" احسن نے آفر کی۔

"نہیں مجھے تو کچھ کام ہے۔ فیکٹری کے معاملات دیکھنے ہیں۔ پھر فصل کی کٹائی کا کام شروع ہو چکا ہے تو۔"

"کم آن یار!" احسن نے منہ بناتے ہوئے اُس کی بات کاٹی۔ "کتنے بور ہوگئے ہو تم۔ کبھی ان زمینوں فصلوں سے باہر نکل کر بھی دیکھو۔ زندگی اس سے بھی خوبصورت چیز کا نام ہے۔"

"وہ تمہاری طرح فارغ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کام کو بوجھ سمجھتا ہے۔ اُسے اپنے کام سے محبت ہے۔" فضہ آپی نے پہلی بار کتاب سے نظریں اٹھا کر کہا۔

"محبت کرنے کے لیے انسان کیا کم ہیں؟" احسن نے ایک نظر ماہم کے چہرے پر ڈال کر کہا۔ وہ جان بوجھ کر ارسلان کو اس بحث میں لپیٹ رہا تھا۔

"ارسلان انسانوں سے بھی محبت کرنے میں تم سے زیادہ سچا اور کھرا انسان ہے۔ اُس کی محبت میں کبھی کوئی کھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔" فضہ آپی نے کتابیں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ ایک ہی جملے میں بحث کو بھی لپیٹ دیا۔

"آؤ ارسلان! تمہیں کھانا نکال دوں۔" فضہ آپی نے کہا۔ وہ جانتی تھیں اس وقت وہ کھانا کھا کر نہیں آیا ہوگا۔ ارسلان فضہ آپی کے ساتھ کچن میں آگیا جبکہ احسن بدمزا سا ہو کر ان لوگوں کے ساتھ آج کا پروگرام ڈسکس کرنے لگا۔

"تم نے نوٹ کیا ارسلان؟" فضہ آپی نے ٹیبل پر برتن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا؟" ارسلان نے چاول پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

"مجھے ماہم کچھ پریشان پریشان سی لگتی ہے۔" فضہ نے جگ میز پر رکھ کر پُرسوچ انداز میں کہا۔ تو اُس کا ہاتھ ایک لمحے کو رُک سا گیا۔

"پریشان۔ پریشان کیوں ہونے لگی۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں محسوس کیا؟"

"تم اُس سے ملے ہی کہاں ہو۔ تم نے تو یہ بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ جب وہ پریشان ہوتی ہے تو اُس کی

آنکھوں کی روشنیاں یکدم سے بجھ جاتی ہیں۔" فضہ نے اسے چھیڑا تو وہ ہنس دیا۔

"مگر میں نے ان روشنیوں کو کئی بار بجھتے دیکھا ہے۔"

"تم نے تو شاعری شروع کر دی۔" ارسلان نے ہنس کر کہا۔ فضہ اُس سے ایک سال چھوٹی تھی مگر اُس نے ہمیشہ ارسلان کو بڑی بہنوں کی طرح ٹریٹ کیا تھا۔ ارسلان بھی اپنی ہر بات اُس سے شیئر کرتا تھا۔

"وہ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتی ہے اور شجاعت چچا نے اُس کے آنے کے بعد صرف ایک بار فون کیا اور صرف ابو سے بات کر کے یہی پوچھا کہ ماہم خیریت سے پہنچ گئی ہے اور ماہم سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ یہ بات حیران کن نہیں؟" فضہ کی بات پر وہ بھی کچھ پریشان ہوگیا۔

"تم نے ماہم سے پوچھا؟"

"نہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ نجانے کیا بات ہے۔ پھر میرا خیال ہے، وہ خود ہی کسی نہ کسی پر اعتبار کر کے اپنی پرابلم شیئر کرے گی۔ آخر ہم غیر نہیں اُس کے اپنے ہیں۔" فضہ نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"ایک اور بات بھی ہے۔"

"اب کیا ہے؟" ارسلان نے چمچ رکھ کر بے چارگی سے کہا تو وہ ہنس دی۔

"اب دیکھو، یہاں تو ہر طرف اس بات کا چرچا ہے کہ تمہاری اور ماہم کی نسبت بچپن سے طے ہے اور ماہم کے آنے پر یہ بات سارے خاندان میں دُہرائی جا رہی ہے۔ جبکہ ماہم اس بات سے یکسر لاعلم ہے۔ پہلے امی، ابو کا خیال تھا کہ شجاعت چچا نے ماہم کو اس لیے پاکستان بھیجا ہے کہ اُس کی اور تمہاری شادی طے کر دی جائے۔ مگر انہوں نے فون پر اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں کی۔" فضہ نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، وہ خود ایسی بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور پھر کوئی واضح نسبت بھی تو طے نہیں ہوئی۔ بس امی اور سدرہ چچی کے درمیان ایک بات ہوئی تھی اور بس۔" ارسلان نے خیال ظاہر کیا۔

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ امی بتاتی ہیں بعد میں باقاعدہ تمہارے امی ابو نے شجاعت چچا اور سدرہ چچی سے بات کی تھی۔ دادا جی اور بی بی جان کے سامنے۔ اور کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا اگر شجاعت چچا بھائیوں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تو بی بی جان کے ذریعے تو کہلوا سکتے تھے۔ وہ تو اُن کی ماں ہیں۔"

فضہ نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر کھڑا ہوگیا۔

"بہرحال آپی! بہتر تو یہی ہے کہ ماہم پر زبردستی یہ فیصلہ مسلط نہ کیا جائے۔ اُس کی پرورش کسی اور ماحول میں ہوئی ہے۔ وہ اچھا بُرا زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ اس بات کا اُس کے سامنے ذکر ہی نہ کیا جائے۔"

"اور اگر وہ کوئی اور فیصلہ کرے تو میرا مطلب ہے آج کل احسن خاصا وقت گھر پر گزارنے لگا ہے۔" فضہ نے شوخی سے کہا تو وہ چپ سا ہوگیا۔

"اگر وہ ایسا کرتی ہے تو بھی کوئی ہرج تو نہیں۔" وہ بڑے آرام سے بولا۔

"دل سے کہہ رہے ہو؟" فضہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ فوراً باہر نکل گیا۔

"ارسلان بھائی! رُک جائیں ناں۔ ہم بس ایک گھنٹے میں نکل رہے ہیں پکنک کے لیے۔" حارث نے اُسے دیکھتے ہی کہا تو وہ نجانے کیوں رُک کر ماہم کو دیکھنے لگا۔ جو دونوں پاؤں سمیٹ کر صوفے پر رکھے بڑے ریلیکس موڈ میں شہلا سے باتیں کر رہی تھی۔

"ماہم!" ارسلان کے پکارنے پر اُس نے چونک کر دیکھا تھا۔

"شجاعت چچا کا فون نہیں آیا۔" اُس نے اچانک پوچھا تھا۔ اور اُسی لمحے ماہم کی اُٹھتی گرتی پلکوں کے نیچے کوندتی بجلیاں گھنے بادلوں میں جا چھپی تھیں یہ دیکھ کر وہ رُکا نہیں فوراً باہر نکل گیا تھا۔

وہ شہر سے سیدھا زمینوں کی طرف آگیا تھا۔ باغ میں آکر اُس نے اسپرے کے ڈبے چچا نورے

کے حوالے کیے۔ ساتھ ہی باقی ہدایات بھی دیں پھر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ جہاں گندم کی کٹائی زوروں پر تھی۔ عمر حیات نگرانی کر رہا تھا۔

"کیا حال ہے عمر۔ کتنا کام رہ گیا ہے؟" ارسلان نے اس کے پاس جا کر آہستگی سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے اور بس چند کھیت رہ گئے ہیں۔" عمر حیات نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"بلکہ میرا خیال ہے خالی کھیتوں میں ٹریکٹر چلا دیا جائے۔ کپاس کی بجائی کا وقت بھی قریب آ رہا ہے۔"

عمر حیات نے کہا تو وہ بس سر ہلا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ جہاں بابا چلے آ رہے تھے۔

"کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" عمر حیات نے اس کی بے توجہی محسوس کرتے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" ارسلان نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔

"عمر! تمہاری ملازمت کا کیا ہوا؟" ارسلان نے پوچھا تو اس کے چہرے پر ملال سا چھا گیا۔

"ملازمتیں ہم جیسوں کو کہاں ملتی ہیں ارسلان صاحب۔ بس یہی کام ٹھیک ہے۔"

"اچھا ایسا کرو۔ پرسوں میں شہر جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔" ارسلان نے کہا۔

"کیوں؟" عمر نے حیرت سے پوچھا۔ "کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔ فیکٹری میں کام شروع ہو گیا ہے۔ میں تو آج کل یہاں مصروف ہوں۔ تم وہاں دیکھ لینا۔ یوں تمہاری ملازمت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"مگر مجھے فیکٹری کے معاملات کا کیا پتا؟" عمر نے پریشانی سے ارسلان کی طرف دیکھا۔

"معاملات کا کیا ہے۔ سیکھ جاؤ گے رفتہ رفتہ۔ میرا منیجر بڑا بھلا آدمی ہے۔ تمہیں سب سکھا دے گا۔" ارسلان نے لاپروائی سے کہا۔

"شکریہ یار! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

عمر حیات نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ارسلان نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ "میں بابا کو بتاتا ہوں" کہہ کر باغ کی طرف بھاگ گیا۔

"یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" چوہدری جاوید نے حیرت سے دھوپ کی تمازت سے اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"بس بابا! وہ ایسے ہی ادھر آ نکلا تھا۔" اس سے کوئی بات ہی نہ بن پائی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" چوہدری جاوید نے اس کے ماتھے پر چمکتا پسینہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ "تمہارا باپ اب اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوا ارسلان بیٹے۔ جاؤ شاباش گھر جاؤ۔"

انہوں نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ سر ہلا کر گھر کی طرف چل دیا۔

"السلام علیکم بی بی جان!" وہ تھکا تھکا سا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"جیتے رہو۔" بی بی جان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بچی نہیں آئی؟" انہوں نے بڑے اشتیاق سے ماہم کا پوچھا تھا جسے انہوں نے کہا تو وہ اس کے ساتھ دوڑی چلی آئے گی۔

"اب اگر وہ بچی نہیں آنا چاہتی تو کیا میں اسے گود میں اٹھا کر لاؤں۔" وہ تو پہلے ہی الجھا ہوا تھا چڑ کر بولا۔

بی بی جان ہکا بکا رہ گئیں۔ عذرا بیگم نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی تھی۔

"کیا بک رہے ہو ارسلان؟" انہوں نے سرزنش کی۔

"تو امی! آپ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ اب ننھی بچی نہیں رہی۔ بڑی ہو گئی ہے۔ اپنی مرضی کی آپ مالک ہے۔ آنا ہو گا تو آ جائے گی۔" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"لو ایسے بلاؤ گے تو بھلا کیوں آنے لگی وہ۔" بی بی جان نے بھی ناراضگی دکھائی۔ انہیں اچھی نہیں لگی تھی ارسلان کی یہ بے زاری۔

"بس ہمیں تو یونہی بلانا آتا ہے۔ آنا ہو گا تو یونہی آ جائیں گی محترمہ اور بس اب۔ یہاں سے کوئی پیغام نہیں جائے گا محترمہ کے لیے۔ آپ لوگوں

کو ملنا ہوا تو وہاں جا کر مل آئیے گا۔"

وہ قطعی لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

سب لوگ کالج یونیورسٹی کے لیے نکلے تھے۔ آفس جانے والے آفس گئے تھے۔ دونوں بڑی تائی اور چھوٹی تائی اماں کچن میں مصروف تھیں۔ وہ تنہائی، وی لاؤنج میں خالی الذہنی کی کیفیت میں ٹی وی پر بھاگتی دوڑتی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سوچ کا محرک پاپا کی ذات تھی۔

نہ جانے ہم کس کے بھروسے پر یہاں آ گئے۔ اور پاپا نے تو جیسے سکون کا سانس لیا۔

ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ بس اتنی ہی اہمیت ہے ہماری پاپا کے نزدیک۔ یوں بھول گئے جیسے۔"

"ہیلو ماہم!" احسن کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ایک طویل سانس لے کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آر یو آل رائٹ؟" اس کے چہرے پر چھائی اداسی کی پرچھائیوں کو احسن نے بھی محسوس کیا تھا۔

"او یس احسن۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"ماہم! تمہیں یہاں کے لوگ کیسے لگے؟" احسن نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"بہت اچھے، بہت پرخلوص۔ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہاں اتنی محبت ملے گی۔ نجانے پاپا یہاں سے کیوں چلے گئے۔" اس نے واقعی دل سے کہا تھا۔

"اور اگر تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا پڑے تو؟" احسن کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"ہم ہمیشہ یہیں رہنے تو آئے ہیں۔" اس نے نظریں چرا کر آہستگی سے کہا۔ وہ نجانے کیا سمجھا کہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ مخملی ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"ماہم! اگر تمہیں میرا ساتھ قبول ہو تو پلیز یہ رکھ لو۔" احسن نے کہا۔

"پلیز احسن بھائی۔" نجانے کیوں اس کی آواز بھیگ سی گئی۔

"کیا ہوا ماہم؟"

"پلیز احسن بھائی! ابھی شادی نہیں کرنا ہے۔" وہ بہت مضطرب سی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"ماہم کیا کوئی اور؟" احسن کا لہجہ بجھ سا گیا۔

"احسن بھائی! یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمیں ابھی شادی کرنا ہی نہیں۔ ہم نے ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔" وہ یکدم ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رو دی۔

"پلیز ماہم! اس طرح تو مت کرو۔ اگر تم نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔ شاید تمہیں میرا یوں اچانک پرپوز کرنا اچھا نہیں لگا۔ اگر تم کہو تو میں ابو سے کہتا ہوں کہ وہ شجاعت چچا سے۔"

"فار گاڈ سیک احسن بھائی! آپ یہ سب بہت جلدی کر رہے ہیں۔ آپ ہمیں یہاں ایڈجسٹ تو ہونے دیں۔ یہاں کے لوگوں کو سمجھنے تو دیں۔" وہ بے چارگی سے بولی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"اوکے۔ میں چلتا ہوں۔ تم ایڈجسٹ ہو جاؤ تو پھر بات کریں گے۔"

احسن یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ بظاہر اس نے بات یوں ہی ادھوری چھوڑ دی تھی مگر دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جلد ہی اپنے والدین سے بات کرے گا۔ کہ اس کے سامنے ارسلان کی ذات تھی۔ جو کسی بھی لمحے اس کے مقابل آ سکتا تھا۔ وہ ماہم کو پسند بھی کرتا تھا اور ماہم کے ذریعے جاپان میں سیٹل ہونے کا گولڈن چانس ابھی مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا احسن۔" فضہ کو جب سے احسن کی اس حرکت کا علم ہوا تھا وہ اس کے پیچھے پڑی تھی۔

"ایسا کیا کر دیا ہے میں نے، جو سب لوگ میرے پیچھے پڑے ہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کہ تم نے کیا کیا ہے۔"

فضہ کو سچ مچ بہت دکھ ہوا تھا جب ماہم نے صاف گوئی سے اسے احسن کے پروپوزل اور اپنے جواب کا بتایا تھا۔ جب فضہ نے یہی بات احسن کی امی کو بتائی تھی تو وہ بھی پریشان ہو اٹھیں۔ آخر خاندان کا معاملہ تھا۔ تبھی انہوں نے فوراً احسن کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس بات کی بھنک بھی احسن کے ابو کے کانوں میں پڑے۔

"کیا کیا ہے میں نے۔ بس شادی کی آفر کی ہے اور یہ کوئی گناہ تو نہیں۔" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے بولا۔

"ارے ایسا کبھی ہوتا بھی ہے ہمارے خاندان میں۔ فٹ سے انگوٹھی نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دی کہ شادی کرو گی مجھ سے۔ نہ کسی سے پوچھا نہ بتایا۔" صدیقہ بیگم کلس کر بولیں۔

"امی! چھوڑیں بھی ان پرانی باتوں کو۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"احسن! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ماہم ارسلان کے ساتھ منسوب ہے۔" فضہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ان دونوں کی بچپن کی منگنی۔"

"بچپن کی منگنی۔ مائی فٹ۔" اس نے دانت کچکچا کر ہتھیلی پر مکا جمایا۔

"کون کرتا ہے آج کل ایسی باتیں آج کے دور میں۔"

"بھلے نہ کریں مگر ہم خاندانی لوگ ہیں۔ اور یاد رکھو اگر ایک بار دلوں میں کدورتیں آ جائیں تو کئی رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔" صدیقہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اور اگر ماہم خود انکار کر دے ارسلان سے شادی کے لیے تو؟" احسن نے کہا تو وہ دونوں چونک گئیں۔

"کیا ماہم نے ایسا کچھ کہا؟" فضہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیا کہے گی جبکہ ابھی اسے کچھ پتا ہی نہیں۔ مگر کہہ تو سکتی ہے ناں!" احسن نے کہا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ماہم کبھی گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرے گی۔

"جو گیم تم کھیل رہے ہو ناں احسن، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ماہم سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟" فضہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیوں کرنا چاہتا ہوں میں ماہم سے شادی؟" احسن کی آواز بلند ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ فضہ کوئی جواب دیتی۔ زیبا نے اندر جھانکا۔

"امی! ہم مارکیٹ جا رہے ہیں۔"

"کیوں؟" وہ غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔

"اف امی! صبح بتایا تو تھا آپ کو۔ ماہم کے لیے اچھا سا ڈریس لینا ہے پرسوں کے ڈنر کے لیے۔ پیسے میں نے ابو سے لے لیے ہیں۔" اس نے جلدی جلدی کہا کہ باہر حارث چلا رہا تھا۔

"جا کس کے ساتھ رہی ہو؟" فضہ نے پوچھا۔

"حارث کے ساتھ۔ آپ چلیں گی؟" اس نے پوچھا تو فضہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو وہ بائے بائے کرتی بھاگ گئی۔

"تو بہتر یہی ہے احسن! تم ماہم کے فیصلے کا انتظار کر لو۔" فضہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

مسٹر برگر سے برگر اور آئس کریم کھانے کے بعد وہ لوگ ڈھیروں پیکٹس اٹھائے گاڑی تک آئے۔

"حارث! ارسلان بھائی کی طرف چلنا ہے؟" شہلا کو اچانک یاد آیا تھا۔

"مگر وہ تو گاؤں گئے ہوں گے۔" حارث نے کیسٹ کی سائیڈ بدلتے ہوئے کہا۔

"میں نے صبح فون کیا تھا وہ شہر آ گئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس وقت اپنے کاٹیج میں ہی ہوں گے۔" شہلا نے کہا تو وہ سر ہلا کر گاڑی کو ریورس کرنے لگا۔

"ارسلان بھائی تم سب سے بہت مختلف ہیں۔" ماہم نے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں پر نظریں جماتے ہوئے رائے دی۔

"ہاں۔ وہ سب بھائیوں سے زیادہ اچھے ہیں۔"

زیبا تو ویسے بھی دیوانی تھی اس کی۔ تب ہی خوش ہو کر تائید کی۔ شہلا کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ پھر لب بھینچ کر مسکرانے لگی۔ ماہم نے اس ڈھلتی شام کے چھوٹے سے سفر کو بہت انجوائے کیا۔ جب گاڑی کے کھلے شیشے سے تیز ہوا اس کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرتی تو لب خود بخود مسکرانے لگتے۔ زیبا بار بار کیسٹ بدل کر اپنے پسندیدہ گانے سن رہی تھی۔ تبھی کسی گانے پر شہلا کو اعتراض ہوتا تو کوئی حارث کو پسند نہ آتا۔ زیبا ان سے لڑنے لگتی تو حارث اونچے سروں میں کوئی گیت گنگنانے لگتا۔ تو وہ دونوں تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگتیں۔ وہ کبھی انہیں دیکھ کر مسکراتی کبھی باہر جھانک کر ڈھلتی شام کی گلابیاں اپنے اندر اتارنے لگتی۔ تبھی گاڑی سنی پلانٹس کی بیلوں اور کاسنی پھولوں سے ڈھکے خوبصورت سے کاٹیج کے سامنے ٹھہر گئی۔ ماہم نے ستائشی نظروں سے اس خوبصورت کاٹیج کو دیکھا۔

"دیکھا ارسلان بھائی موجود ہیں۔" پورچ میں اس کی گاڑی دیکھ کر شہلا نے خوش ہو کر کہا۔ حارث نے گاڑی باہر ہی پارک کی۔ چوکیدار وغیرہ کہیں نہیں تھا۔

ماہم ان کی تقلید میں اندر آ گئی۔ گھر بہت خوبصورتی اور نفاست سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ وہ اسے گھر کے مختلف حصے دکھاتے بیڈ روم میں آ گئے۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر وہ لوگ اندر آ گئے۔ نیم تاریک کمرے میں ہلکی ہلکی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ پنکھے کی ہوا کے ساتھ کھڑکیوں پر لگے سفید حریری پردے ہل رہے تھے۔ ارسلان بیڈ پر نیم دراز شاید پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ سرمئی کرتے شلوار میں وہ بالکل غافل پڑا تھا۔ کتاب پھسل کر بیڈ پر جا گری تھی۔

"ارسلان بھائی!" زیبا نے پیچھے سے جا کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پکارا۔ اس نے کسمسا کر زیبا کا ہاتھ پکڑا تو وہ ہنستی ہوئی سامنے آ گئی۔

"اوہ تم لوگ؟" وہ ڈھیلے ڈھیلے انداز میں تکیہ ٹھیک کرنے لگا۔ ماہم کو دیکھا تو اٹھ بیٹھا (کون جانے کہ ابھی ابھی یہی اک خواب میری آنکھوں میں آن ٹھہرا تھا)

"اوہ ماہم۔ کیسی ہیں؟"

"ہم بالکل ٹھیک ہیں ارسلان بھائی۔" وہ مسکرا دی تھی۔ پنک پرنٹڈ لان کی شرٹ اور پلین دوپٹہ شلوار میں وہ بہت مسرور سی نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس اس کے معصوم سے چہرے کو کچھ اور گلابی کر رہا تھا۔

"یہ تم لوگوں نے اچانک کیسے پلان بنا لیا؟" اس نے کتاب اٹھا کر بک شیلف میں رکھی۔

"خود تو کبھی آتے ہی نہیں۔" زیبا نے ہمیشہ والا شکوہ دہرایا۔

"میرا خیال ہے میں دو چکر تو لگا ہی لیتا ہوں۔ باقی یہی رہ جاتا ہے کہ تم یہیں شفٹ کر جاؤ۔" وہ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"ارسلان بھائی! ہم آپ کے لیے ایک خبر لائے ہیں۔" حارث بے تکلفی سے اس کے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

"اگر سنتا ہوں۔" وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ شہلا اس کی کتابیں دیکھنے لگی۔ گیتوں کی دیوانی زیبا ڈیک کے پاس رکھے سفید فلور کشن پر دھڑا دھڑ کیسٹیں کھنگالنے لگی۔ ماہم کمرے کی ڈیکوریشن دیکھ رہی تھی۔

"ہاں اب بولو کیا خبر ہے؟" وہ تولیے سے چہرا صاف کرتا باہر نکلا۔

"پرسوں ہم ماہم کی آمد کو سیلیبریٹ کر رہے ہیں۔ آپ کے ذمے یہ کام ہے کہ نہ صرف آپ نے خود تشریف لانا ہے بلکہ بی بی جان، تایا جان اور چاچا جان کو بھی لانا ہے۔" شہلا نے کہا۔

"ٹھیک اور کچھ؟" ارسلان نے روم ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر فروٹ کی باسکٹ اور کولڈ

ڈرنکس نکالے۔

"اب اور کچھ نہیں۔" حارث فوراً اُٹھ بیٹھا۔

شہلا اُسے گھورنے لگی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی ارسلان بھائی! ہم ابھی بازار سے بہت کچھ کھا کے آئے ہیں۔"

"ماہم پہلی بار میرے گھر آئی ہے اور ہم ٹھہرے دیہاتی بندے، کسی مہمان کو بغیر خاطر تواضع کے جانے دیں، یہ ہماری روایت نہیں۔"

ارسلان نے کہا اور کچن سے گلاس لا کر ٹیبل پر رکھنے لگا۔

"آپ اسے گھر کہتے ہیں ارسلان بھائی؟" زیبا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"تو کیا تمہیں یہ مرغی خانہ نظر آ رہا ہے؟" حارث نے منہ بنایا۔

"ابھی تو یہ صرف مکان ہے۔ گھر تو تب بنے گا جب۔" وہ نجانے کیا کہنے جا رہی تھی۔

"زیبا گڑیا! ایک گلاس کم ہو گیا ہے ذرا بھاگ کر کچن سے پکڑ تا۔"

ارسلان کے سنجیدہ سے لہجے پر وہ منہ بناتی اُٹھ گئی۔ ارسلان نے سب کو کولڈ ڈرنکس پیش کیے۔ وہ کافی دیر ٹھہرے۔ یونہی خوش گپیوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

"ماہم! آپ کو شاعری سے لگاؤ ہے؟" جب وہ لوگ جانے کو کھڑے ہوئے تو ارسلان نے پوچھا۔

"ارے ارسلان بھائی! آپ کو نہیں پتا۔ ماہم آپی نے اردو لٹریچر میں ماسٹر کیا ہے۔ ہے ناں حیرت کی بات جاپان میں اردو۔" زیبا نے چہک کر کہا۔

"آپ کی معلومات خاصی ناکافی ہیں زیبا بی بی۔ اب جاپان کی یونیورسٹیز میں الگ سے اردو کا شعبہ ہوتا ہے۔" حارث نے اُسے چڑایا۔

"اور پتا ہے۔ ماہم آپی نے ہمیں بہت سی جاپانی نظمیں بھی سنائی تھیں۔" زیبا نے اٹھلا کر کہا۔

"گویا بھینس کے آگے بین بجائی تھی۔" حارث کے کہنے پر جہاں زیبا کا منہ بنا وہیں ماہم کھلکھلا کر ہنس دی۔ جیسے بہت دور پہاڑوں میں اچانک کوئی جھرنا گنگنایا ہو۔

"یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔" ارسلان نے ریک سے محسن نقوی کی "عذابِ دید" نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ان سے پوچھیں، جب یہ لوگ پہلی بار یہاں آئے تھے تو میں نے ان سب کو گفٹس دیے تھے۔" ارسلان نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً یہ بھی آپ کی روایت ہو گی۔" ماہم نے مسکراتے ہوئے کتاب تھامی۔ (جب اس کا چہرا مسکراتا ہے تو اس کی آنکھوں کی روشنی کتنی بڑھ جاتی ہے۔)

وہ انہیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ جب واپس آیا تو اُس کے عجیب سے احساسات تھے۔ اُس نے ایک طویل سانس لے کر گھر کے در و دیوار کو دیکھا۔ ساری فضا مہکی مہکی سی تھی اور بام و در مسکرا رہے تھے۔ ہاں ابھی یہاں کوئی آیا تھا۔ ہوا کی ہنسی اُس کے کانوں میں گونجی تو گھنی مونچھوں تلے لب خود بخود مسکرا دیے تھے۔

بی بی جان کی گھن گرج ایسی تھی کہ صدیقہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا تھا۔ جتنا وہ اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں، اُتنا زیادہ غصہ اُبل رہا تھا اور وہ تو جانتی تھیں کہ بی بی جان کے احساسات ماہم کے بارے میں کیسے ہیں۔ اسی لیے بیٹے کو روک رہی تھیں۔ عذرا اچھی الگ منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔

"بھابی! تم ہی سمجھاؤ بی بی جان کو۔ بچہ تھا آخر کر بیٹھا ایسی حرکت۔ خوامخواہ بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔" انہوں نے عذرا کو سمجھانا چاہا۔

"تمہیں تو پتا ہے کہ ماہم ہمارے لیے کیا ہے۔ اُس کی مرتی ہوئی ماں نے بار بار میرا ہاتھ پکڑ کر وعدہ لیا تھا کہ میں ماہم کو بھٹکنے نہیں دوں گی۔ اپنے ارسلان کی دُلہن بناؤں گی۔ مرد کا کیا ہے کل کلاں دوسری شادی کرے تو میری بچی تو رُل جائے گی۔" انہوں نے

دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔

"میں تو کلیجے سے لگا کر رکھتی اگر شجاعت بھائی ضد نہ کرتے ماہم کو ساتھ لے جانے کی۔" عذرا بیگم نے دل گرفتہ سے لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے بھابی! میرے لیے تو جیسا احسن ویسا ارسلان۔ میں نے تو کبھی دونوں میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ بس اب بات یہیں ختم کریں۔ میں تو ویسے بھی شہلا کے لیے سوچ رہی ہوں۔ اگر بات باہر نکلی تو شہلا کیا سوچے گی۔"

"بچی کا دل بُرا ہو گا بھابی! احسن کا کیا ہے سمجھ جائے گا۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا تو وہ چپ ہو گئیں۔

باہر لان میں ہنگامہ سا بپا تھا۔ گو زیادہ مہمان نہیں تھے۔ بس ینگ جنریشن نے اپنے اپنے فرینڈز کو بلایا اور باقی گھر کے افراد تھے۔ مگر سب ہی ہنگاموں کے شوقین۔ ارسلان ابھی ابھی پہنچا تھا۔ مختلف مہمانوں سے ملتا وہ اندر کی طرف آ گیا تو زیبا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"میرا دل چاہتا ہے آپ سے خوب لڑوں۔ اتنی دیر سے آئے ہیں غیروں کی طرح۔"

"خدا کے لیے لڑکی مجھے معاف کر دو۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بے چارگی سے کہا۔ "میں جتنا زیادہ مصروف ہوں آج کل۔ تم اتنا پیچھے پڑی ہو۔"

"آج کل آپ کو مصروف نہیں رہنا چاہیے ناں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ کم از کم آج سب سے پہلے تشریف لاتے۔" وہ نجانے اُسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"لیکن چیف گیسٹ تو سب سے آخر میں آتے ہیں۔" وہ اُسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔

"اس ڈنر کے چیف گیسٹ آپ نہیں ماہم آپی ہیں۔" اُس نے چڑ کر اطلاع دی۔

"ہاں وہ تو ہیں۔" وہ گردن موڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ جو زعفرانی خوبصورت سے ڈریس میں سلیقے سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ اپنے گھنگھریالے بال شانوں پر پھیلائے سہج سہج قدم اُٹھاتی شہلا کے ساتھ سب مہمانوں سے مل رہی تھی۔ ایک ملکوتی سی مسکراہٹ مستقل اُس کے ہونٹوں پر بکھری تھی۔

"بعض لوگ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں ناں؟" زیبا نے کہا۔

"ہاں!" اُس نے تائید کی تھی۔ جب مڑ کر دیکھا تو زیبا اُسے دیکھ رہی تھی۔

"پگلی!" اُس نے مسکرا کر اُس کے سر پر چپت لگائی۔

"کیوں آپ خوبصورت نہیں ہیں؟" زیبا نے معصومیت سے پوچھا۔

"بہنوں کو تو اپنے بھائی لگتے ہی ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ آپ جیسے ہوں۔" زیبا نے ستائشی نظروں سے اُسے دیکھا۔ بلیک پینٹ سفید براق شرٹ اور بلیک ٹائی میں وہ عام دنوں سے بہت مختلف اور متفرد لگ رہا تھا۔ ایک دم اسمارٹ اور ڈیسنٹ سا۔ سیاہ کوٹ بے پروائی سے بازو پر ڈال رکھا تھا۔

"آپ کی ساری خوبصورتی تو آپ کے پُرخلوص انداز کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جو بات میں امی اور فضا آپی سے بھی نہیں کر سکتی وہ بڑے آرام سے آپ سے کر لیتی ہوں۔" زیبا نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں تو اُسے اس چھوٹی سی لڑکی پر پیار آ گیا۔

"بھائیوں کو بہنوں کا دوست ہونا چاہیے تبھی وہ بہنوں کے پرابلمز شیئر کر سکتے ہیں۔"

"یہ بات آپ اسد اور حارث کو بھی سمجھا دیں۔" اُس نے منہ بنایا۔

"انہیں بھی سمجھا دیں گے۔ اب راستہ بھی چھوڑو۔" اُس نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے ماہم وغیرہ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ لان کی تینوں سیڑھیاں عبور کر کے آگے بڑھا تبھی اُس کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز ہلکی سی آواز سے ٹوٹی تھی۔ اُس نے فوراً پاؤں ہٹا کر دیکھا۔ سنہری نازک سی پازیب جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اُس کے بھاری بوٹ کے نیچے آ کر اُس میں لگے منے منے سے گھنگرو ایک سائیڈ سے ٹوٹ گئے تھے۔ اُس نے جھک کر پازیب اُٹھائی اور

بے اختیار مڑ کر لان کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے ماہم نے شہلا کے کان میں کچھ کہا تھا۔ شہلا نے گھبرا کر اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا تھا۔ نجانے کیوں ارسلان نے مٹھی بند کر کے پینٹ کی جیب میں گھسا لی اور تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

بہت سے خوبصورت اور مانوس سے منظر تھے۔ جو نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ دُور تک پھیلے سنہری اور سبز رنگ کا خوبصورت امتزاج۔ گندم کی سنہری لہلہاتی بالیاں، مکئی کی نوخیز فصل، کاٹی ہوئی گندم کے گٹھے بناتے کسان، کھیتوں میں لگے تھریشر۔ ندی کے کنارے کپڑے دھوتی عورتیں اور ان کے گرد بھاگتے دوڑتے پانی کے چھینٹے اڑاتے ننگ دھڑنگ بچے۔ کھیتوں سے واپس آتی سروں پر لسی کی گڑوی اور چنگیر اٹھاتی عورتیں۔ اور آموں کے باغات۔ ڈھلتی شام کے پس منظر میں یہ سب کچھ بہت رومینٹک لگ رہا تھا اور آسمان پر وہ تھے جیسا چاند۔ رات کے وقت یہی چاند آسمان کے ماتھے کا سنگھار تھا اور اس وقت یہی چاند آسمان کے سینے پر لگا داغ لگ رہا تھا۔

"ماہم! کیا سوچ رہی ہو؟" ارسلان نے سست روی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

گاؤں کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ ہر گزرنے والا ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے سر ہلا دیتا۔ ماہم ایک طویل سانس لے کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کچھ پریشان ہو؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں تو۔" ماہم نے دونوں ہاتھ گود میں رکھتے ہوئے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائیں۔

"بعض لوگوں کے چہرے اُن کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دیتے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"ہم کوئی جھوٹ نہیں بول رہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"بہرحال۔" اُس نے بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دایاں ہاتھ شرٹ کی اوپری جیب میں ڈالا۔

"کیا اس کے لیے پریشان تھیں؟" ارسلان نے اُس کے سامنے ہاتھ کھولا۔ وہ اُس کی چوڑی ہتھیلی پر دھری سنہری پازیب دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"یہ۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آئی؟" ارسلان نے بس مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ماہم نے پازیب اُس کی ہتھیلی سے اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں بھینچ لی۔

"کیا بہت اہم ہے یہ!" ارسلان نے پوچھا۔

"یہ ہماری ماما کی ہے۔ بس یہی تو ایک نشانی ہے اُن کی ہمارے پاس۔ اس دن سب کے اصرار پر ہم نے پہن لی تھی۔ ہم واقعی اس کے لیے بہت پریشان تھے۔" ماہم نے مدھم سے لہجے میں بتایا۔

"اس دن یہ ہمارے پیر سے جوتے تلے آ گئی تھی۔" ارسلان نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی شاید اس کے "ہم" پر مذاق کر رہا ہے۔ خفگی سے اُسے دیکھ کر باہر جھانکنے لگی۔ اُس نے محسوس نہیں کیا۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے اس دن آپ کو بتایا نہیں۔ آج ہی جیولر سے ٹھیک کروا کر لا رہا ہوں۔" وہ چپ چاپ ہاتھ پہ دھری پازیب سے کھیلتی رہی۔

"ماہم! آپ کو کبھی بھی کوئی پریشانی، کوئی مشکل پیش آئے تو ہم میں سے کسی پر اعتبار ضرور کیجیے گا۔ ہم سب آپ کے اپنے ہیں۔" اُس نے گمبھیر لہجے میں آخری بات کہی۔ ماہم چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

(زیبا نے کہا تھا۔ ماہم آپی آپ جب بھی بے اعتبار ہونے لگیں تو ایک شخص پر اعتبار ضرور کرنا۔ اُس کی آنکھیں بہت سچی اور بات کھری ہے اور اس کی بے ریا مسکراہٹ آپ کے سارے دکھ سمیٹ لے گی) ارسلان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔ وہ گھبرا کر باہر دیکھنے لگی۔

جب وہ حویلی میں داخل ہوئے تو سب نے اُسے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے وہ برسوں بعد آئی ہو۔ حالانکہ ابھی پرسوں ڈنر پر سب لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ دو کالے بکرے پہلے ہی منگوا لیے تھے۔

"یہ کس لیے بی بی جان؟" بی بی جان نے اُسے ہاتھ لگانے کو کہا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"تمہارے صدقے کے لیے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

وہ اتنی محبتیں پا کر نہال ہوئی جا رہی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی صحن میں ایرکولر چل رہے تھے۔ سلونی شام میں مٹی کی سوندھی سوندھی مہک دل و دماغ کو سکون بخش رہی تھی۔ کھلے آنگن کے آخری کونے میں بنے تنور سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور بہت دُور سے آتی چکی کی آواز بہت بھلی لگ رہی تھی۔

"لو بھئی۔ آج ہماری بیٹی کو دودھ کی میٹھی لسی پلاؤ۔ کبھی پی تو نہیں ہو گی۔" تایا جاوید نے پوچھا تو اُس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جاؤ بھئی عذرا، ہماری بیٹی کے لیے مزے دار سی لسی منگواؤ۔"

تایا جاوید نے کہا تو وہ چھینو کو آواز دینے لگیں۔ ارسلان اُسے چھوڑ کر نجانے کدھر چلا گیا تھا۔ وہ گھر کا جائزہ لینے لگی۔ یہ دو منزلہ کھلے سے صحن اور کھلے کھلے کمروں والا گھر تھا۔ جسے عرفِ عام میں چوہدریوں کی حویلی کہا جاتا تھا۔ اب اس میں تھوڑی تبدیلی کر کے گیراج بھی بنا لیا گیا تھا۔ کھلے سے صحن کے دوسرے کونے میں انار کا درخت تھا۔ جس کے نیچے مرغی اپنے ننھے منے چوزوں کو لے کر گھوم رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے مرغی کے بچوں کو دیکھنے لگی۔ تبھی چھینو شیشے کے خوبصورت جگ میں دودھ کی میٹھی لسی لے آئی۔ تائی جان نے چھوٹی میز کھینچ کر۔ دونوں چارپائیوں کے درمیان رکھ کر چھینو سے بڑے پکڑ لی۔ تبھی ارسلان تولیے سے گیلے بال جھٹکتا آ گیا۔ شاید وہ غسل کرنے چلا گیا تھا۔ اُس نے پینٹ شرٹ بدل کر بادامی کرتا شلوار پہن لیا تھا۔

"یہ تو واقعی بہت مزے دار ہے۔" ماہم نے ٹھنڈی لسی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"شہروں میں شام کی چائے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں دودھ کی لسی۔" ارسلان نے تائی جان کے ہاتھ سے گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

جب تک ماہم نے پہلا گلاس خالی کیا وہ دو گلاس ـــــــــ خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔

"ابو! میں کچھ لوگوں سے مل آؤں۔" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"یہ چھینو ہے۔ یہیں رہتی ہے حویلی میں۔ پچھلی بار جب تم آئی تھیں یہ ساتھ والے گاؤں میں اپنے رشتے داروں سے ملنے گئی تھی۔"

تائی جان نے بتایا تو ماہم نے دلچسپی سے اُس شرمائی شرمائی سی نوعمر لڑکی کو دیکھا۔ جو بڑی مہارت سے تنور میں روٹیاں لگا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ چور نظروں سے اُسے بھی دیکھ لیتی۔

"تائی اماں! آپ کو یوں روٹیاں پکاتی آتی ہیں؟" ماہم نے دلچسپی سے تنور میں روٹیاں لگنے کا عمل دیکھا۔

"نہیں۔ مجھے نہیں آتیں۔ مہمان زیادہ ہوں تو تنور گرم کرتے ہیں۔ آج ساتھ والے گاؤں سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

مغرب کے بعد دسترخوان بچھ گیا۔ تائی اماں نے آج بھی بہت اہتمام کیا تھا۔ تایا جان اور ارسلان نے باہر ہی مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ بعد میں چھینو پھرتی سے صحن میں چارپائیاں بچھانے اور بستر لگانے لگی۔

"جب سے ارسلان شہر سے پانی والے پکھے لایا ہے بڑا آرام ہے۔" بی بی جان اُسے بتا رہی تھیں۔ تائی اماں ابھی تک دودھ سنبھالنے میں لگی تھیں۔ جو شام کے وقت آیا تھا۔ دونوں سائیڈوں میں ایرکولر لگائے گئے تھے۔ ارسلان نے شام کرتے ہی پانی والی موٹر سے پائپ لگا کر پنکھوں میں پانی بھر دیا تھا۔ وہ ارسلان کا دوسرے کزنز سے تقابل کرنے لگی۔ جہاں ارسلان کی کھلتی ہوئی

گندمی رنگت، مضبوط جسم، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اور مسکراتے لب اس کی ظاہری شخصیت کو جاذبیت عطا کرتے تھے۔ وہیں اس کے لہجے کا کھرا پن، سیاہ آنکھوں میں تیرتی شریر سی چمک اور پُرخلوص سی مسکراہٹ اسے دوسروں میں نمایاں اور ہر کام خود کرنے کا جذبہ دوسروں سے منفرد بناتا تھا۔ تبھی تائی جان سب کے لیے ٹھنڈے دودھ کے گلاس لے آئیں۔ ایک طرف تایا جان اور ارسلان کے بستر تھے۔ دوسری طرف بی بی جان، تائی اماں، ماہم اور چھینو کا۔ ماہم کو کھلے آسمان تلے سونا بہت عجیب بھی لگ رہا تھا اور بہت اچھا بھی۔ آسمان پر رات نے اپنا ستاروں بھرا آنچل پھیلا دیا تھا اور چیت کا پورا چاند ان ستاروں کے درمیان جگر جگر کر رہا تھا۔

"تائی اماں! ہماری ماما کیسی تھیں؟"

تصور کی سرزمین پر بہت دھندلی تصویریں تھیں۔ وہ ان تصویروں کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ تائی اماں، ماما کے بارے میں بتانے لگیں۔ ان کی شکل و صورت، ان کی عادات، ان کی باتیں۔ وہ مبہوت سی ٹمٹماتے ستاروں پر نظریں جمائے سنتی رہی۔

"اور جب ماما فوت ہوئی تھیں، اُس وقت رات تھی، بہت کالی رات۔" ماہم کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

"ہاں۔ ہم نے بہت کوشش کی تھی۔ مگر ہم ابھی ڈاکٹر کو بلا بھی نہ پائے تھے کہ وہ۔" عذرا بیگم کے ذہن میں وہ منظر تازہ ہو گیا۔

"اُس وقت بارش ہو رہی تھی اور لائٹ چلی گئی تھی۔ اور ہم کمرے میں بالکل اکیلے تھے۔" ماہم کی آواز کپکپا گئی تھی۔

"ماہم بیٹی!" عذرا بیگم نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

"آپ کو پتا ہے تائی اماں! ہمیں اب بھی ڈر لگتا ہے جب بارش ہو رہی ہو اور رات کا وقت ہو۔"

اُس نے تائی اماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔ چاندنی میں بھیگا اُس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ تائی اماں کا ہاتھ اُس کے سر پر ٹھہر گیا۔

صبح اُس کی آنکھ جھٹپٹے کے عالم میں کھلی تھی۔ اُس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ سب لوگ اٹھ گئے تھے۔ چھینو آنگن میں ہولے ہولے جھاڑو دے رہی تھی۔

"بی بی جی!" باہر بہت زور سے گیٹ بجایا گیا تھا۔

"آئی چاچا!" چھینو جھاڑو چھوڑ کر گیٹ کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دودھ سے لبالب بھری بالٹیاں دودھ کر کے لے آئی۔ چاروں بالٹیاں اُس نے ڈھانپ کر سائیڈ پر بنے چولہے کے پاس رکھ دیں۔

"چھینو! دودھ آ گیا ہے؟" تائی اماں نے باہر آ کر پوچھا۔

"جی بی بی۔" چھینو نے دوبارہ جھاڑو سنبھال لی تھی۔ "دو بالٹیوں کا دودھ اوپر رکھ دے۔ میں ناشتا بناؤں۔"

انہوں نے کہا۔ چھینو نے چولہے میں ایک ترتیب سے اپلے رکھ کر سلگائے پھر بڑی سی گاڑنیوں میں دودھ ڈال کر اوپر رکھ دیا۔ جہاں دھیمی دھیمی آنچ پر دودھ پکتا تھا۔

"السلام علیکم تائی اماں!"

اچانک اُس کے منہ سے نکلا تو وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ بہت پہلے جب وہ یہاں رہتی تھی تو بی جان نے اسے سکھایا تھا کہ صبح اٹھ کر بڑوں کو سلام کرتے ہیں۔ آج برسوں پہلے کا سکھایا گیا سبق اچانک اُسے یاد آیا تھا۔ تائی اماں جواب دے کر کچن میں آنے لگیں۔ پھر پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا کہ اُسے باتھ روم کا رستہ بتا دیں۔ مگر اُسے باتھ روم کی طرف جاتا دیکھ کر انہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ گویا وہ کچھ بھی بھولی نہ تھی۔ باتھ روم سے نکل کر وہ سیدھا کچن میں آ گئی۔ جہاں خستہ خستہ پراٹھوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ ارسلان وہیں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ وہ بھی بے تکلفی سے چوکی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"ماہم! چلو کمرے میں۔ میں بھجواتی ہوں ناشتا۔ چھینو ڈبل روٹی لینے گئی ہے۔" تائی اماں نے کہا۔

"امی! اسے کوئی پراٹھا وراٹھا کھلائیں۔ اتنی نازک سی ہے لگتا ہے وہاں جاپان میں تو کچھ کھاتی ہی نہیں تھی۔" ارسلان نے ناشتا ختم کر کے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تائی اماں ہمیں پراٹھا ہی دے دیں۔"

"لو یہ تو مذاق کر رہا ہے بس آتی ہی ہوگی چھینو!" تائی اماں نے خفگی سے ارسلان کو گھورا۔

"نہیں تائی اماں! ہمارا خود بھی دل چاہ رہا ہے پراٹھا کھانے کو۔"

"ہم تو ٹھہرے دیہاتی بندے۔ چوکی پر بیٹھ کر کھانا ہماری مجبوری ٹھہری۔ عادت جو ہے۔ کم از کم آپ تو ٹیبل تک چلیں۔" وہ چائے ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔

"آپ طنز کر رہے ہیں ارسلان بھائی!" ماہم نے سنجیدگی سے سر اٹھا کر اُس اونچے لمبے شخص کی سیاہ آنکھوں میں تیرتی شریر سی چمک کو دیکھا تو وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلاتا باہر نکلنے لگا۔

"بھابی! یہ لیں ڈبل روٹی۔"

"اب یہ تم کھا لو۔" وہ چھینو کے سر پر چپت لگا کر باہر نکل گیا۔ ماہم چپ چاپ آملیٹ کے ساتھ پراٹھا ختم کرنے لگی۔

"ماہم بیٹی! گھر میں کتنے ہی کمرے خالی پڑے ہیں۔ تم دیکھ لو۔ پھر چھینو سے کہہ کر اپنا سامان لگوا لینا۔" تائی اماں نے کہا تو وہ سر ہلا کر چائے کپ میں انڈیلنے لگی۔

"ہمارے ہاں تو سب لسی پیتے ہیں۔ بس ارسلان کو ہی عادت ہے چائے کی۔" تائی نے ہنس کر کہا۔

"مجھے تو جی چائے بڑی اچھی لگتی ہے۔" چھینو نے خوش ہو کر اسے بتایا۔ ناشتے کے بعد وہ چھینو کے ساتھ سارا گھر گھومنے لگی۔ اُس کی کیفیت بہت عجیب سی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اُس نے خواب میں دیکھا ہے۔ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ تبھی ایک کمرے کے سامنے رُک سی گئی۔ اُس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں دو بڑے بڑے پایوں والے پلنگ پڑے تھے۔ باقی کمرہ خالی تھا اور گرد آلود ہو رہا تھا۔

"یہاں تو جی کوئی آتا جاتا ہی نہیں۔ نیچے ہی کافی کمرے ہیں۔" چھینو بولی۔ ماہم نے آگے بڑھ کر مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ بہت دور تک پھیلا کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ سامنے تھا۔ چھینو اُسے نجانے کون کون سی تفصیلات سنا رہی تھی۔

"ماہم بیٹے! اب گھر آ جاؤ۔ بہت شام ہو گئی ہے۔" کھڑکی سے ماما اُسے بلا رہی۔ تھیں۔ چار سالہ ماہم نے سروں کے پیلے پھول چنتے چنتے سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"باجی جی آپ کو یاد ہے جب آپ یہاں رہتی تھیں۔" چھینو نے اُسے بغیر پلکیں جھپکائے بہت دور آسمان کی وسعتوں کو کھوجتے دیکھا۔

"چھینو ہمارے لیے یہی کمرہ صاف کر دو۔ ہم یہیں ٹھہریں گے۔" نجانے کہاں سے ایک آنسو اُس کی پلکوں میں آن ٹکا تھا۔

"پر جی یہاں سب سے الگ۔" چھینو نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"اللہ میاں جی! ہمیں بھی ایک بھائی دے دو۔" وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلائے دعا مانگ رہی تھی۔

"ہمیں کیا معلوم تھا ماما کہ بھائی اس دنیا میں آنے گا تو آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں کبھی بھی ایسی دعا نہ کرتی۔" وہ کھڑکی پہ ماتھا ٹکا کر رو دی۔ چھینو بٹر بٹر اُس کا منہ تک رہی تھی۔

شام کو سب حسبِ معمول اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ وہ بور ہوتی کبھی انار کے پودے

پر لگے اناروں کو گننے لگتی تو کبھی اُس کے نیچے کٹ کٹاتی مُرغی کے بچوں کو، کبھی یونہی پاؤں سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگتی۔

"دل نہیں لگ رہا۔" تائی جان نے اُس کے بے زار سے چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا تو اُس نے منہ بنا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ ہمیں کچھ کرنے بھی تو نہیں دیتیں لائیں یہ چاول ہم چُن دیں۔" اُس نے اُن کے ہاتھ سے چاولوں بھرا تھال لینے کی کوشش کی۔

"لو رہنے دو بھلا میں تم سے کام کرواؤں گی۔" انہوں نے اُس کا ہاتھ پیچھے کر دیا۔ تو وہ منہ بسورنے لگی۔

"اسے ماہم پتر شجاعت کا فون نہیں آیا؟" بی بی جان نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ چپ سی ہو گئی۔

"اب اُن کا فون نہیں آئے گا۔" اُس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ شاید خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔

"کیوں بھلا؟" تائی اماں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"اس لیے کہ اُنہوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔" وہ نظریں چُرا کر اچانک بولی سب ہکا بکا رہ گئے۔

"اسی لیے ہم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پاپا ہمیں اگنور کرنے لگے تھے۔ ہم نے یہاں آنے کی بات کی تو خفا ہونے لگے۔ ہمارا وہاں دم گھٹنے لگا تھا بی جان!" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

"تم نے بہت اچھا کیا ماہم پتر ہم ہیں نا تمہارے اپنے۔" بی بی جان نے اُسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تو وہ خود کو سنبھالنے لگی۔

"ہم بہت ہرٹ ہوئے تھے۔ مگر ہم نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے آخر پاپا کب تک اپنی تنہائیوں سے لڑتے رہتے انہیں ایک اچھی ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور ہم اُن کے راستے کی دیوار نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لیے یہاں آ گئے۔" ماہم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"چھینو جاؤ باجی کو چھت پر لے جاؤ اس کا دل بہل جائے گا۔" تائی اماں نے چھینو کو پکار کر کہا تو وہ بھاگتی ہوئی آئی۔

"چلیں باجی اوپر سے سارا گاؤں نظر آتا ہے۔" چھینو نے اُس کا ہاتھ تھاما تو وہ اُس کے ساتھ اوپر آ گئی۔ چھت کے اردگرد چھوٹی سی دیوار کھڑی کی گئی تھی۔ یہاں سے سارا گاؤں نظر آتا تھا۔ ہر گھر سے اٹھتا دھواں، چکی کی کوکو اور پرندوں کی اڑانیں شام کی اُداسی کو کچھ اور بڑھا رہی تھیں۔

"گاؤں کی شامیں کتنی اُداس ہوتی ہیں نا!" اُس نے چھینو سے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں جی!" وہ اپنے پراندے سے کھیلتی بے پروائی سے بولی۔

"باجی جی! آپ انگریزی نہیں بولتیں۔"

"اس لیے کہ جہاں سے ہم آئے ہیں، وہاں انگریزی نہیں بولی جاتی۔" ماہم نے ہنس کر کہا۔

"اچھا جی!" چھینو کو حیرت ہوئی تھی۔

"باجی جی آپ پینٹ بھی پہنتی ہیں؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا تو ماہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پتا ہے مجھے بہت شوق ہے پینٹ پہننے کا۔" چھینو نے شرما لجا کر دوپٹے کا کونا منہ میں دبا کر کہا۔ تو وہ مسکرا دی۔

"اگلی بار جب ہم شہر جائیں گے تو تمہارے لیے بھی لے آئیں گے۔"

"ہائے نہیں ابا تو میری گردن دبا دے گا۔" چھینو نے گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟" ارسلان سفید کاٹن کے کرتا شلوار میں گاڑی کی چابی ہاتھ میں گھماتا خوشگوار اور لائٹ سے موڈ میں اوپر آیا تھا۔

"کچھ نہیں بس یونہی۔"

"اچھا میں شہر جا رہا ہوں کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔" ارسلان نے پوچھا۔

"اس وقت بھائی جی!" چھینو نے حیرت سے ڈھلتی شام کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں کچھ کام ہے تو۔" وہ سوالیہ نظروں سے ماہم کی طرف دیکھنے لگا۔

"منگوانا تو!" وہ شرارت سے چھینو کی طرف دیکھنے لگی اور اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ جیسے بہت دور چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ تبھی سڑک کی طرف سے چھوٹا سا قافلہ آتا نظر آیا۔

ماہم سامنے کی دیوار کے پاس آ گئی۔ عورتیں بھی تھیں۔ بچے بھی۔ ایک اونٹ کی مہار تھامے لمبا چوغہ پہنے دوسرے ہاتھ سے کوئی ساز بجاتا بہت اونچی آواز میں گا رہا تھا۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ اس کی بلند ہوتی آواز شام کے سناٹے کو چیرتی ہر طرف بکھر رہی تھی۔ جیسے ساری فضا اُس آواز کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔

میرے ہاتھ کٹورہ اسے مانگاں دا
میرا پیر ولی اینال راواں دا!
شاناں والیا پیرا پیرا ہو پیرا!

"یہ تو میں نے حارث کے پاس سنا تھا۔" ماہم نے مڑ کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

"ہاں آجکل بہت مقبول ہے یہ گیت۔ جبکہ یہ گیت صدیوں سے ان فضاؤں میں چاہے میرے بچپن بلکہ بی بی جان کے بچپن سے یہ گیت ان قافلوں کے ساتھ چلا آ رہا ہے، یہ لوگ پیر سائیں کے دربار پر منتیں مانگنے جا رہے ہیں۔ بس چہرے بدل جاتے ہیں، یہ گیت یہ سفر یونہی رہتا ہے۔"

میرے ہاتھ گڑی دیاں ٹھوٹھیاں
میرا پیر نچاتے میں جھوٹی آں

"اوکے ماہم! پھر میں چلتا ہوں۔" وہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے رکا۔ مگر وہ چپ چاپ دیوار پر کہنی ٹکائے باہر دیکھتی رہی۔

میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
نی میں پیر مناون چلی آں
شاناں والیا پیرا!

قافلہ گزر گیا تھا۔ مگر فضا میں اب تک اس گیت کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

اُس نے ارسلان کی گاڑی کو بہت دور ایک ہیولے کی شکل میں گم ہوتے دیکھا۔

"باجی جی او باجی جی!" چھینو اُسے بُری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے۔" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔

"باجی جی بارش آ گئی ہے۔" تبھی اُسے احساس ہوا بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور ہوا بہت تیز تھی۔ پورا آسمان کالی گھور چادر میں لپٹا تھا۔

"آندھی بھی ہے جی آپ اپنے کمرے میں چلو۔" چھینو نے جلدی جلدی اُس کا بستر لپیٹ کر کندھے پر رکھا۔ تائی اماں اور چھینو جلدی جلدی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ ارسلان اور تایا جاوید بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ بی بی جان بھی اندر چلی گئی تھیں۔

تبھی ارسلان آ کر پنکھے اندر کرنے لگا۔ بوندیں اُس کے وجود کو بھگو رہی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے اُڑتے دوپٹے اور دوسرے سے بالوں کو سنبھالتے ہوئے نجانے کیوں وہیں کھڑی رہی۔

"ماہم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ اندر آ جاؤ آندھی بہت زوروں کی ہے۔" ارسلان نے حیرت سے اُسے وہیں کھڑے دیکھا تو پکار کر کہا۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ کمرے سے آنے والی روشنی اُس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ارسلان کو وہ خوفزدہ سی لگی۔

"ماہم اندر امی کے کمرے میں چلی جاؤ۔" ارسلان نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا تو وہ چونک گئی۔

"نہیں چھینو ہمارے کمرے میں سو جائے گی۔" دوپٹہ اُڑ کر ارسلان کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔

"چھینو!" ارسلان نے ایک دم مڑ کر اُدھر اُدھر چیزیں سمیٹتی چھینو کو پکارا۔

"چھوڑو دیر سب، ماہم کے ساتھ اوپر جاؤ۔" چھینو نے سب کچھ چھوڑا۔ اور اُس کے ساتھ اوپر آ گئی۔ وہ کچھ لمحے ماہم کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا رہا پھر پلٹ گیا۔

چھینو تو لیٹتے ہی غافل ہو گئی۔ مگر وہ پلنگ پر بیٹھی۔ شوریدہ سر ہواؤں کی اکھاڑ پچھاڑ سنتی رہی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ مگر وہ خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ بلکہ کھلی کھڑکی کے لرزتے پٹ اسے کچھ اور خوفزدہ کر رہے تھے وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی۔

"چھینو!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پکارا۔ "یہ کھڑکی بند کر دو۔"

چھینو کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اسے چھینو کے وجود سے بھی خوف آ رہا تھا۔

"کاش ہم تائی اماں کے پاس چلے گئے ہوتے" نجانے اس وقت کیا سمائی کہ وہ چھینو کو لے کر اوپر آ گئی۔ حالانکہ وہ اس وقت بھی خوفزدہ تھی۔ عین اسی لمحے لائٹ چلی گئی۔

"چھینو۔" اس نے پورے زور سے پکارا۔

"کیا ہوا بی بی؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"چھینو لائٹ چلی گئی ہے۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔

"ٹھہرو باجی: میں ابھی موم بتی لاتی ہوں۔" چھینو جلدی سے بستر سے اتر کر باہر نکل گئی۔

"نجانے کہاں مر گئی ہے۔" اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔

"عذرا میری ماہم کا خیال رکھنا۔" سدرہ نے عذرا کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"سدرہ ایسی باتیں مت کرو۔ شجاعت بھائی ڈاکٹر کو لے کر آتے ہی ہوں گے۔"

"نہیں عذرا! تم وعدہ کرو۔ تم میری ماہم کو سنبھالو گی۔ اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہو گی۔"

"وہ میری بیٹی ہی تو ہے۔" عذرا نے اسے تسلی دی۔ تبھی بی بی جان کی نظر ڈری سہمی ماہم پر پڑی۔

"عذرا! ماہم کو پرے لے جاؤ۔"

"نہیں ہم ماما کے پاس رہیں گے۔" وہ مچل گئی مگر وہ اسے گود میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئیں۔

"تائی اماں ہمیں بہت ڈر لگے گا۔ باہر بہت بارش ہو رہی ہے۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں انہیں روکا۔

"نہ میری چندا بیٹی ڈرنا نہیں میں ابھی ارسلان کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔"

وہ پیار سے کہہ کر باہر نکل گئیں۔ تبھی کہیں نزدیک ہی بہت زور سے بجلی گری تھی۔ پانچ سالہ ماہم نے چیختے ہوئے بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا۔

"چھینو کہاں رہ گئی ہو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پاؤں بستر سے نیچے اتارے اور آہستگی سے چلتی دروازے تک آئی۔ تبھی بادل زور سے گرجے۔ وہ ڈر کر بھاگی تو سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا۔ اس نے بمشکل دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ اس کے دروازے کے پٹ زور سے بجے۔

"ماما!" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر چیخی۔

"ماہم!" اسی لمحے اندھیرے میں بھاری مردانہ آواز گونجی۔

"ارسلان بھائی!" ماہم نے ڈرتے ڈرتے پکارا۔

"ماہم کہاں ہو؟" گھپ اندھیرے میں بس آواز اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

"ارسلان بھائی!" ماہم نے دوبارہ پکارا تھا۔

"ڈرو نہیں ماہم۔ میں ہوں نا۔ ہاتھ آگے بڑھاؤ۔" ارسلان کی نرم آواز اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا دوسرے لمحے اس کا ہاتھ ارسلان کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔ اسے ایکدم سے تحفظ کا احساس ہوا۔

"ٹیک اٹ ایزی۔ آہستہ آہستہ نیچے اترو۔" وہ اس کے بازو کے سہارے ایک ایک سیڑھی اترتی چلی گئی۔ تبھی مدھم سی روشنی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" تائی اماں ہاتھ میں لالٹین پکڑے کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے چھینو بھی تھی۔ ماہم تائی اماں سے لپٹ کر بری طرح رو دی۔ ارسلان

نے طویل سانس لے کر لالٹین ان کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ اسے ساتھ لگائے لگائے تسلیاں دیتی اپنے کمرے تک لے گئیں۔

"میں شہر جا رہا ہوں ماہم چلو گی؟" وہ اس کے دل بہلنے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ وہ بہت مضمحل اور پژمردہ سی نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ کے بغیر وہ ہونٹ کتنے عجیب لگ رہے تھے۔ اور آنکھیں ایسے جیسے آسمان پر کالے گھور بادل آ کر سارے ستارے چھپا دیں۔ زرد لباس میں اس کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ ارسلان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے روشنیاں چرا کر ان آنکھوں میں بھر دے کاش وہ اب بھی وہی ماہم ہوتی، جو ذرا اداس ہوتی تھی تو وہ اسے پورے گاؤں کی سیر کرواتا۔ اسے اپنے سارے کھلونے دے دیتا۔ خود سے گھڑ کر کہانیاں سناتا۔

مگر اب نہ تو اس کے پاس کھلونے تھے اور نہ وہ چھوٹی بچی تھی کہ کہانیوں سے بہل جاتی۔ وہ اس کے ساتھ ہی شہر آ گئی۔ شہلا زیبا اور حارث کی پُرلطف باتوں کی وجہ سے وہ بہل ہی گئی کہ پاپا کا فون آ گیا۔ اتفاق سے ریسیور بھی ماہم ہی نے لیا۔ پاپا کی آواز سنتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی انہیں بھی اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوا۔ کتنی ہی دیر اس سے معذرت کرتے رہے۔ اور پھر وہی اصرار کہ واپس آ جاؤ۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔

"اب یہ ہمارے اختیار میں نہیں رہا۔" ماہم نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اوپر سے احسن کا اصرار کہ وہ جلد کوئی فیصلہ کرے۔ وہ دو دن سے زیادہ وہاں ٹھہر نہ سکی۔ دوبارہ گاؤں آ گئی۔

"تائی اماں ہم گاؤں کی سیر کر آئیں۔" اس نے دوپٹے پر کروشیے سے بیل بناتی تائی اماں سے پوچھا۔ ان کے پاس ہی ارسلان منہ پر اخبار رکھے لیٹا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" انہوں نے خوشدلی سے کہا۔ وہ تو بس اسے خوش دیکھنا چاہتی تھیں۔

"مگر جاؤ گی کس کے ساتھ چھینو بھی نجانے کدھر نکل گئی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئیں۔

"ارسلان!" انہوں نے ارسلان کے چہرے سے اخبار ہٹایا۔

"جاؤ ماہم کو گاؤں کی سیر کروا لاؤ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ جو وائٹ جینز پر ریڈ کلر کے کرتے جس کے بازوؤں پر سندھی کڑھائی سے بیلیں بنی تھیں۔ اور ہم رنگ بڑے سے دوپٹے کو شانوں پر پھیلائے کھڑی تھی۔

"ایسے ٹھیک ہے؟" اس نے معصومانہ سی ادا کے ساتھ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گیا۔

"امی چھینو آئے تو اسے بھی بھیج دیجیے گا۔" ارسلان نے چپل پہنی اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اور ماہم بھری دوپہر میں کاغذ کی کشتیاں لے کر سب سے نظر بچا کر باہر نکلے ہوں۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ماہم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

آہ بچپن!

یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی!
مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون!
وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

نہ دنیا کا غم تھا نہ رشتوں کے بندھن
بڑی خوبصورت تھی وہ زندگانی
"تمہیں یاد ہے ماہم!" وہ سڑک عبور کر کے ندی کے پاس آ گئے تھے۔

"یہاں اس پانی میں ہم کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔"

"اور ماما بہت ڈانٹا کرتی تھیں۔" ماہم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ سنہری دن جو گئے

کی طرح اُسے چھو کر گزرے تھے۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُن کا ہاتھ تھام لے۔

(اور ہمیں ہمیشہ اپنی کشتی میں پانی ڈال دیا کرتا تھا کہ کہیں تم ہار نہ جاؤ) وہ ایک چھلانگ میں ندی عبور کر گیا تھا۔

"اُدھر سے آؤں۔" ماہم نے اُس طرف اشارہ کیا جدھر چند لمبی لمبی لکڑیاں رکھ کر گزرنے کے لیے رستہ بنایا گیا تھا۔

"وہ تو ٹوٹ گیا ہے۔ یہیں سے آجاؤ کچھ زیادہ چوڑی تو نہیں۔" ارسلان نے کہا اور خود منہ موڑ کر پیپل کی شاخ توڑنے لگا۔ ماہم نے نگاہوں سے ندی کی چوڑائی کو ناپا۔ پھر آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ ندی تو تیار ہو گئی۔ مگر پاؤں پھسل گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گری مگر فوراً اُٹھ کر دونوں ہاتھ جھاڑنے لگی۔

"ہم نے پار کر لی۔" اُس نے خوش ہو کر بتایا۔

"جی بہت کمال کیا!" وہ بے اختیار ہنسا۔

"آئیے!"

ماہم نے کچھ آگے جا کر دوبارہ مڑ کر دیکھا تو ٹھٹھک کر رُک گئی۔ ننھا سا بچہ کمر پر اٹھائے سر پر روپیوں کی چنگیر رکھے وہ عورت خراماں خراماں ندی پر بنے پل سے گزر رہی تھی۔ ماہم نے پاؤں پٹخ کر غصے سے اُسے گھورا۔ وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا ——— بھٹی پہ مکئی کے دانے بھونتی عورت کے پاس جا کر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"السلام علیکم!" عورت کے گرد تین چار بچے قمیص کے دامنوں میں دانے بھرے اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔ ماہم کو دیکھ کر شرمانے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ ماہم نے مسکرا کر ایک بچے کو ہاتھ ہلایا تو وہ دانے چھوڑ چھاڑ بھاگ گیا۔ بھٹی میں آگ جل رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے مٹھی بھر مکئی اُس میں ڈالی۔ اُس کے جھریوں زدہ ہاتھ میں پکڑی ورانتی بڑی تیزی سے دانوں کو اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ مکئی کے دانے چٹخ رہے تھے۔

"ارے میرا پتر۔" بوڑھی عورت سب چھوڑ چھاڑ اُن کی طرف پلٹی۔ اور دونوں ہاتھ ارسلان کے سر پر پھیر کر ——— لمبی عمر کی دُعا دینے لگی۔

"اسنے کون اسے پتر!" (یہ کون ہے؟) اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ماہم کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"چاچے کی بیٹی ہے اماں! ولایت والے چاچے کی!" اماں شاید اونچا سنتی تھی۔ تبھی ارسلان اُس کے کان میں بڑے زور سے بولا تھا۔

"اچھا اچھا ماشاء اللہ رج کے سوہنی اسے" اماں نے آگے بڑھ کر اُس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا ——— ماہم حیران تھی کہ نہ جان نہ پہچان، پھر بھی وہی خلوص، وہی دعا اُس کے حصے میں آئی تھی۔

"اچھا اماں! ہم چلتے ہیں۔" ارسلان نے اونچی آواز میں کہا۔

"لے پتر، دانے تو لے جا۔" اماں نے کہا تو ارسلان نے ہنستے ہوئے اُس کی چنگیر میں سے گرم گرم دانوں کی مٹھی بھر لی۔ اور پھر سلام کر کے آگے آگیا۔ اماں کی درانتی کڑاہی میں دوبارہ چلنے لگی تھی۔

"لو۔" اُس نے دانے ماہم کی طرف بڑھائے۔

"مجھے نہیں کھانے۔" ماہم کو شاید ندی والی بات یاد آگئی تھی۔ تبھی منہ پھلا کر بولی۔ تو وہ ہنس دیا۔

"آئی ایم ساری۔ لو نا۔ بھٹی کے دانے بہت میٹھے اور مزے کے ہوتے ہیں۔" ارسلان نے آدھی مٹھی اُس کے ہاتھ میں خالی کی۔ دانے گرم تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔ وہ مزے سے کھائے جا رہا تھا۔

"آپ کو گرم نہیں لگ رہے۔" ماہم نے حیرت سے پوچھا۔

"خترمہ یہ ایک محنت کش کے ہاتھ ہیں، ہر سردی گرمی سہنے والے۔" ماہم نے ایک نظر اپنے سامنے پھیلی چوڑی ہتھیلی کو دیکھا۔

"آپ خود ٹریکٹر کیوں چلاتے ہیں؟" ماہم نے پوچھا۔

"آپ خود کو ہم کیوں کہتی ہیں؟" سوال گندم

کے جواب چنا۔

"آپ کو کیا ہے؟" ماہم نے تپ کر کہا۔

"نہیں ہمیں تو کچھ نہیں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"اور جہاں تک تعلق ہے میرے ٹریکٹر چلانے کا تو میرے دادا جان ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ جس کسان کا پسینہ اُس کی زمینوں پر نہیں گرتا تو وہ زمینیں بنجر ہونے لگتی ہیں۔ آئیں۔ میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔" دور سے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ مکانوں کی ایک قطار عبور کر کے وہ دوسری طرف آئے۔ یہاں سے کھیتوں کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ڈھول پورے زور سے بج رہے تھے، بہت سے لوگ بھنگڑا بھی ڈال رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ماہم نے حیرت اور دلچسپی سے اُس ہنگامے کو دیکھا۔

"یہ دو کسانوں کے درمیان فصل کی کٹائی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔" وہ کچھ دیر وہیں کھڑے دیکھتے رہے۔ کٹائی آخری مرحلے تک جا پہنچی تھی۔ جیتنے والے کے ہاتھوں میں تیزی اُتر آئی تھی۔ عجیب دلچسپ ہنگامہ تھا۔

"آئیں آپ کو اپنا باغ دکھاؤں۔" باغ تک جاتے جاتے اُس نے گاؤں کی اور بھی بہت سی چیزیں دکھائی تھیں۔ گاؤں کی مسجد، گاؤں کا کنواں زیادہ تر مرد کھیتوں میں جا چکے تھے۔ جبکہ عورتیں تندہی سے گھر کے کام نبٹا رہی تھیں۔

راستے میں آتی جاتی بہت سی عورتیں کوئی کندھے پر جارہ اٹھائے، کوئی اُپلے تھاپتی حیرت اور دلچسپی سے اُن کی طرف دیکھتیں۔ بزرگ خواتین آگے بڑھ کر ارسلان کے سر پر ہاتھ رکھتیں۔ اور ماہم کا سراپا جائزہ بھی لیتیں۔

"یہ لڑکیاں آپ کو دیکھ کر دانتوں میں دوپٹہ کیوں دبا لیتی ہیں؟" ماہم نے اچانک اُس سے پوچھا۔

جواباً چہرے پہ در آنے والی مسکراہٹ چھپانے کے لیے ارسلان نے بے اختیار منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"لیجیے جناب۔ یہ ہے ہمارا باغ۔" باغ سے اُٹھتی کچے آموں کی مہکار نے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ راوی کی طرف سے آتی بھیگی ہوائیں تیزی آتی تو کچے آموں کی مہک کچھ اور بڑھ جاتی۔ ماہم تھکے تھکے انداز میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"بھوک لگی ہے؟" ارسلان نے مسکرا کر پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔" وہ یہ کہہ کر ندی پھلانگ کر دوسری طرف چلا گیا۔ تربوز کی بیلیں پھیلی تھیں۔ اُس نے ٹھونک بجا کر چند تربوزوں کو دیکھا۔ پھر ایک تربوز توڑ لیا۔ اور اس اثنا میں وہ جوتا اُتار کر جینز کے پائنچے ٹخنوں تک چڑھا کر ندی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ ندی کا ٹھنڈا پانی گدگدی کرتا رواں دواں تھا۔

"اس میں مینڈک بھی ہوتے ہیں۔" اُس نے آتے ہی کہا۔ ماہم نے جھٹ پاؤں باہر نکال لیے۔ جبکہ وہ بڑے مزے سے پینٹ کے پائنچے چڑھا کر اُس کے سامنے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ ماہم نے مشکوک سی نظروں سے پہلے اُسے اور پھر ندی کے صاف و شفاف پانی کو دیکھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت تیر رہی تھی۔ مگر وہ دوبارہ پانی میں پاؤں ڈالنے کی ہمت نہ کر پائی تھی۔ خجل سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ارسلان نے تربوز پانی میں ٹھنڈا ہونے کو رکھ دیا تھا۔ کتنی دیر وہ اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ تربوز پانی میں تیرتا آگے بڑھنے لگتا تو وہ دوبارہ اُسے اپنے سامنے کر لیتا۔

"یہ آپ ہمیں کبھی تم اور کبھی آپ کیوں کہتے ہیں۔" ماہم نے پوچھا تو وہ چپ سا ہو گیا۔ (کبھی اتنی دور لگتی ہو کہ بے اختیار منہ سے آپ نکل جاتا ہے اور کبھی۔ اُس نے ایک نظر اُس کے گلابی چہرے پر ڈالی تھی۔ اور کبھی اتنی نزدیک کہ "تم" بھی تکلف لگتا ہے)

اُس نے پانی میں تیرتا تربوز نکالا۔ پاس پڑی اینٹ پر مار کر دو ٹکڑے کیے۔ ایک ماہم کی طرف بڑھایا۔ اور دوسرا بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ کی

دو انگلیوں کی مدد سے سرخ گودا نکال کر کھانے لگا۔ جب ماہم پر نظر پڑی تو وہ حیرت سے کبھی اُسے تو کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹکڑے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خجل سا ہو گیا۔

"اور چاچا نورے۔" ارسلان نے آواز دی۔ دوسری آواز پر چاچا نورا ندی کے پار بنے کچے کمرے سے بھاگ آیا۔

"او ارسلان پتر۔" تبھی اُس کی نظر ماہم پر پڑی۔ "اچھا۔ اچھا دھی رانی بھی آئی ہے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"چاچا! تمہارے پاس کوئی ٹرچ وغیرہ ہو گا۔"

"ہاں ہے۔" وہ بھاگا گیا۔ تھوڑی دیر میں ڈولی اٹھا کر لے آیا۔

"چاچا جی! ہمیں تربوز کھانا ہے۔" ارسلان نے کہا۔

"اوہ اچھا!" وہ دوبارہ کمرے کی طرف آیا۔ ایک بڑا سا چھرا اور پرات اٹھا لایا۔ اُس نے جلدی جلدی تربوز کی قاشیں کیں۔

"جانی جی۔ او باجی جی!" چھینو بھاگی آ رہی تھی۔

"جانی جی۔ وہ بی بی جان کہتی ہیں۔ سارا دن ادھر ہی گزار دو گے۔ روٹی نہیں کھانی۔"

"کھانا بھی کھائیں گے پہلے تم ادھر سے سلاد کے لیے چیزیں توڑ لو۔ اور خربوزے بھی۔" ارسلان نے کہا۔ تو وہ بھاگتی ہوئی چاچا نورے سے ایک ٹوکری لے آئی۔ ککڑیاں، ٹماٹر اور خربوزے توڑ کر ٹوکری میں رکھ کر اُس نے سر پر اٹھا لی۔ ارسلان اُن کے آگے چلا جا رہا تھا۔ چھینو کی زبان حسبِ معمول چل رہی تھی۔

"یہ باغ چوہدری صاحب نے لگایا تھا۔ اور باقی چیزیں بھائی جی نے لگائی ہیں۔ سارے فروٹ۔ پھل، سبزیاں شہر والوں کو بھی جاتی ہیں۔ وہ لوگ تو عیش کر رہے ہیں۔ بھائی جی کی وجہ سے ہر روز تازہ دودھ مکھن جاتا ہے۔"

"چھینو! بڑی زبان چلتی ہے تیری۔" ارسلان نے مڑ کر اُسے گھورا۔

"لو جی، میں کون سا غلط کہہ رہی ہوں۔" اُس نے منہ بنایا۔ ندی چھلانگ کر ارسلان نے مڑ کر ماہم کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمکتی مسکراہٹ دیکھ کر چھینو کا ہاتھ تھام کر پل کی طرف مڑ گئی۔

اُسے یہاں آئے دو ماہ ہو گئے تھے گرمیاں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ ایک بے کلی سی اُس کے پورے وجود کا احاطہ کیے رکھتی۔

"ہم یہاں کیوں آئے تھے۔" لمبی جلتی دوپہروں میں وہ خود سے الجھتی رہتی۔ پاپا ہر فون پر اُسے واپس بلاتے۔ وہ یہاں سے گھبرا کر شہر جاتی تو احسن کی منتظر نگاہیں اُسے مزید نروس کر دیتیں۔ وہ خود سے لڑتی رہتی۔ الجھتی رہتی۔ اور ایک وہ تھا۔ جس کی نگاہوں میں احترام بھی تھا اور اپنائیت بھی۔ اور ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ بھی۔ مگر زبان پر چپ کے تالے تھے۔

"کیوں نہیں۔" وہ کچھ کہتا۔ اکیلے کمرے میں خود سے لڑ پڑتی پچھلے دو دن سے وہ شہر گیا ہوا تھا وہ سارا سارا دن اُس کی منتظر رہتی۔ سب لوگ سو گئے تھے۔ وہ بھی کتنی ہی دیر پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہی

پھر تنگ آ کر باہر نکل آئی۔ جلتی دوپہر میں وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھومنے لگی۔ کمروں میں، بڑے بڑے برآمدوں میں۔ پھر وہ برآمدے میں رکھے موڑھے پر آ بیٹھی۔

"نجانے کب اُس شخص کی ہمراہی کی خواہش ہمارے دل میں جاگی۔ شاید روزِ ازل سے۔ یا شاید اُس دن سے جب ہم ڈر گئے۔ تو اُس کے مضبوط ہاتھ کا لمس ہمیں ہر خوف سے بے نیاز کر گیا۔

اب ہم منتظر ہیں

اور وہ بے خبر

اُس نے انار کے پیڑ پر بیٹھی چڑیا کو دیکھا۔ زیبا کہتی تھی۔

"ماہم آپی اُس شخص کی محبت سمندروں جیسی گہری اور بارش کے پہلے قطرے جیسی پاکیزہ ہے۔ اُن سے بڑھ کر کوئی آپ کو چاہ ہی نہیں سکتا

میرا بھائی بھی نہیں۔"

"مگر ہمیں تو لگتا ہے وہ شخص پتھر ہے ہر احساس سے عاری۔ بے حس۔" اُس نے بے بسی سے انگلیاں چٹخائیں۔

"کیوں کیا زیبا تم لوگوں نے ایسا۔ کیوں ہمیں احساس دلایا کہ وہ ہمیشہ سے ہمارا منتظر تھا۔"

"ماہم یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔" ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ!" وہ چونک گئی۔

"آپ آ گئے ارسلان بھائی!" عجب سرخوشی اُس کے وجود پر چھا گئی تھی۔

"اس بار بہت دن لگا دیے آپ نے۔"

"نہیں۔ دو ہی تو دن ہوئے ہیں۔ مگر تم اتنی گرمی میں یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" وہ اس کی بے تابی نظر انداز کر کے پوچھنے لگا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئی۔

"ہم نے آپ کو بہت مس کیا تھا۔" وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

"اچھا!" ارسلان نے ایک لمحے کے لیے گلاب چہرے پر چمکتے پسینے کے قطروں کو دیکھا۔

"ہم اکیلے بور ہو رہے تھے۔"

"تو فون کر لیا ہوتا۔" وہ سادگی سے کہہ کر بی بی جان کا پوچھنے لگا۔

"اندر ہیں۔" اُس نے آہستگی سے کہا تو وہ اُسے بھی اندر آنے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بے یقینی سے اُس کی چوڑی پشت پر نظریں جمائے کھڑی رہی پھر بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شام کو چھینو اُسے کئی بار بلانے آئی مگر وہ نیچے نہیں اتری۔

"نہانے سے پہلے سر پر تیل ضرور لگوانا۔ بالکل ہی روکھے ہو گئے ہیں تمہارے بال۔" عذرا بیگم نے اُسے تولیہ کندھے پر رکھے باتھ روم کی طرف جاتے دیکھا تو کہا۔ ساتھ ہی چھینو کو آواز دے کر تیل کی شیشی لانے کو کہا۔ ارسلان موڑھا کھینچ کر چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔

"ماہم کہاں ہے؟" اُس نے تولیہ کندھوں پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"اوپر ہی ہے۔" عذرا بیگم نے تیل اُس کے سر پر ملنا شروع کیا۔

"ارسلان! ماہم آجکل بہت پریشان ہے۔" اُنہوں نے تفکر سے کہا۔

"محسوس تو میں نے بھی کیا ہے امی۔ میرا خیال ہے وہ یہاں ایڈجسٹ نہیں کر پائی۔"

"ہو سکتا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں اب شجاعت بھائی سے بات کر ہی لوں۔" اُنہوں نے کہا تو وہ چپ سا ہو گیا۔

"امی! میرا خیال ہے آپ رہنے دیں۔"

"کیوں؟" وہ حیران رہ گئیں۔

"آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ وہ یہاں خوش نہیں ہے۔"

"ارے اگر یہاں خوش نہیں ہے تو تم اُسے شہر لے جانا۔ مجھے تو بس تم لوگوں کی خوشی عزیز ہے۔ بس میں جلد ہی بات کر لوں گی بھائی شجاعت سے۔" اُنہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ تو وہ جھنجلا گیا۔

"کمال کرتی ہیں امی آپ بھی، وہ کوئی گاؤں کی پلی بڑھی دبو سی لڑکی نہیں ہے۔ جو چپ چاپ اُس کھونٹے سے بندھ جائے۔ جس سے آپ لوگ چاہیں، وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔"

"تو پھر کیا کروں میں؟" انہیں غصہ آ گیا۔

"امی! آپ کچھ دن انتظار کر لیں۔ پہلے میں اُس سے بات کر لوں۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا باؤلے ہو گئے ہو۔ بھلا ایسا بھی ہوا ہے کبھی۔" اُنہوں نے اُس کے سر کو ٹھوکا دیا۔

"امی! اب وہ آپ کا زمانہ نہیں رہا۔ وہ آج کے دور کی باشعور لڑکی ہے۔"

"اچھا پر اپنے باپ اور بی بی جان کو خبر نہ ہونے دینا۔" اُنہوں نے کچھ سوچ کر اجازت دی۔ تبھی ماہم آ گئی۔

"آؤ ماہم!" عذرا بیگم نے پیار سے پکارا۔

وہ ارسلان کو یکسر نظر انداز کر کے اُن کے پاس آگئی۔
ارسلان نے ایک نظر اُس کے مضمحل سے چہرے کو دیکھا اور تولیہ اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔

نہ آپ چلتے نہ دیتے ہیں راستہ ہم کو
تھکی تھکی سی یہ شامیں یہ اونگھتے ہوئے دن
اونگھتے، سلگتے اور جلتے ہوئے دن، رگِ جاں کو کاٹتے لمحات۔

"کہاں جاؤں، کدھر جاؤں۔ کیوں آئے تھے ہم اس دیس میں صرف درد کے موتی سمیٹنے" وہ اپنے گھٹنوں پر رکھے رو دیے جاتی۔ پاپا کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ایک دن اُنہوں نے کہا کہ وہ ٹکٹ بھیج رہے ہیں، وہ سن کر گم صم سی ہو گئی۔

"ہاں تو ٹھیک ہی ہے۔ کس کے لیے رکیں۔ اُس کے لیے جو رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے مگر جلتے ہوئے سورج جیسا۔ چھونا چاہیں تو ہاتھ جل جائیں۔ کاش" اُس نے دور اُڑتی کونجوں کی قطار کو دیکھا۔

"کاش ماما آپ ہمارے پاس ہوتیں۔ ہم آپ کو سب بتاتے۔ آپ کی گود میں سر رکھ کر بہت سا روتے۔ سب کچھ کہہ دیتے آپ سے۔ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کس کو چاہتے ہیں۔"

"یس" دروازے پر دستک کے جواب میں اُس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ماہم!" ارسلان کی آواز پر اُس نے بے اختیار پلٹنا چاہا۔ مگر خود پر قابو پا کر یونہی کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔

"ماہم!" اُس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔

"جی!" وہ منتظر تھی مگر جواب ایک گہری چپ تھی۔

"آپ کو بی بی جان بلا رہی ہیں۔" وہ بہت آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ ماہم نے مڑ کر بند دروازے کو دیکھا اور پھر کھڑکی کے پٹ پر سر ٹکا کر رو دی۔

"کیوں ہو جاتا ہوں میں اتنا کمزور، کیوں نہیں کہہ سکتا میں اُس سے کہ میری زندگی میں خوشی کا دوسرا نام ماہم ہے۔"

ماہم
جو سرتاپا حسن ہے
چاندنی سے بنا پیکر
ابرِ نیساں کے پہلے قطرے جیسی پاکیزہ
اور

"میں نے اُس کا صدیوں انتظار کیا ہے۔ مگر وہ کسی دور دیس کی شہزادی ہے۔ جسے آخر لوٹ جانا ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں۔ کہیں میں اُس کے در پر صدا لگاؤں تو وہ مغرور شہزادی میرے کاسۂ دل میں انکار کے سکے ڈال کر چڑھتے سورج کی سرزمین پر لوٹ نہ جائے اور مجھے ٹھکراتے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ارسلان سے ڈر لگتا ہے۔"

غصہ غبار کی طرح اُس کے دماغ پر چڑھا تھا۔
"تائی اماں! ہم واپس پاپا کے پاس جا رہے ہیں۔" اُس نے بڑی مشکل سے خود کو اس فیصلے کے لیے تیار کیا تھا۔ سب اُس کے اچانک فیصلے پر ششدر رہ گئے تھے۔

"کیا ہوا پتر دل نہیں لگا؟" تایا جان نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بڑی مشکل سے اُس نے خود کو ان نمکین پانیوں میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔

"ٹھیک کہا تایا جان! ہمارا واقعی یہاں دل نہیں لگا۔" اُس نے دانستہ خود کو ارسلان کی طرف دیکھنے سے روکا تھا۔ اُس کی بات پر ارسلان کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ (حالانکہ سارا فساد اس دل کا ہی تو ہے)

"ہم پرسوں یہاں سے شہر جائیں گے۔" اُس نے قطعی لہجے میں کہا۔ اور ان سب کی طرف دیکھے بغیر اوپر چلی گئی۔

"ہاں ٹھیک ہے نا۔ آخر کب تک ہم جھولی پھیلائے چند سکے اقرار کی اس میں بیٹھے رہیں گے

جانے کہاں ہے اُس کی سمندروں جتنی گہری محبت کا۔
بی بی جان اُسے ماما کا سارا زیور دینے پر اصرار کر رہی تھیں۔ جواب تک اُن کے پاس رکھا تھا۔
"نہیں بی بی جان آپ انہیں اپنے پاس ہی رکھیں۔ ہمیں ان کی بالکل ضرورت نہیں۔"
(درد کے موتی ہم جو لے جا رہے ہیں، وہ ان سے زیادہ انمول ہیں۔)
"مگر بیٹی یہ سب تمہاری امانت ہیں۔" تائی اماں کی آواز بار بار بھرا جاتی۔ حسرت سے اُس کا چہرہ تکتیں۔
شام کو اُسے جانا تھا۔ بی بی جان اور تائی اماں کاموں میں کسی فوتگی میں گئی تھیں۔
وہ نجانے کیا سوچ کر ارسلان کے کمرے میں آگئی۔
"ماہم آپ!" وہ اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"جی!" وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اُس کے کمرے میں کیا کرنے آئی ہے۔ چپ چاپ ہاتھ کی انگلیاں مروڑتی رہی۔
"ہم جا رہے ہیں۔" نجانے کیسے اُس کے منہ سے نکلا تھا۔ (نہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ اُسے معلوم تو ہے کہ ہم جا رہے ہیں) وہ پچھتانے لگی۔
"ماہم!" بھاری گمبھیر آواز پر وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے کچھ کہنے کو لب کھولے۔ پھر سختی سے لب بھینچ کر رُخ موڑ گیا۔
(نہیں ارسلان اپنی بات کہنے کا کیا فائدہ)
اُس نے خود کو سرزنش کی۔
"میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" وہ بلاوجہ میز پر کتابیں ٹھیک کرنے لگا۔
"اور کچھ؟" ایک آخری اُمید کے سہارے ماہم نے پوچھا۔
(کہہ دو کہ ماہم رُک جاؤ) ماہم کا دل دہائی دے رہا تھا۔
"اور کچھ نہیں۔"
"آپ!" ماہم نے دونوں مٹھیاں بھینچیں۔
"آپ کبھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

اُس نے دانت پیس کر کہا اور راستے میں آئی چھوٹی سی ٹیبل کو ٹھوکر سے پیچھے کرتی باہر نکل گئی۔ اور وہ یونہی کھڑا اُس کی بات پر غور کرتا رہا۔

"باجی جی! کیا کر رہی ہو؟" چھینو نے اُسے افراتفری میں سامان سمیٹتے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

"ہم جا رہے ہیں۔" اُس نے غصے میں سب ٹھونس ٹھانس کر زپ بند کی۔

"بی بی جان کو تو آنے دیں۔ یا بھائی جی کو ساتھ لے لیں۔ اکیلی کیسے جائیں گی۔" چھینو نے دہائی دی۔

"بھائی جی!" وہ دانت پیس کر اُس کی طرف مڑی۔

"سنو چھینو ہم جا رہے ہیں۔" اُس نے ایک جھٹکے سے بیگ کھینچا۔ "اور اپنے ان بھائی جی سے کہنا کہ ان زمینوں اور فصلوں سے زیادہ اہم انسان ہوتے ہیں۔ ان سے باہر نکل کر دیکھیں۔ زندگی ان سے زیادہ خوبصورت چیز کا نام ہے۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ چھینو ہکا بکا کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ پھر سرپٹ ارسلان کے کمرے کی طرف دوڑی۔

بہت سی ان کہی باتیں
جو تیرے بن ادھوری ہیں
رو پہلی چاندنی راتیں
جو تیرے بن گزاری ہیں
کبھی تم کو بلاتی ہیں
کبھی تم کو سناتی ہیں
وہ تیرے ہجر کے قصے
مہکی ساون کی برساتیں
بہت سے بیت گئے موسم
سونی ہیں بہت گلیاں
تمہیں اب بھی بلاتی ہیں
آنگن میں کھلی کلیاں

"بھائی جی! بھائی جی! باجی جی چلی گئیں۔"

"کہاں چلی گئیں؟" وہ ایکدم سیدھا ہوا۔

"وہ جی شہر چلی گئی ہیں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"وہ جی اکیلی چلی گئی ہیں۔ اور پیدل۔ اور بھائی وہ کہہ کر گئی ہیں کہ اپنے بھائی جی سے کہنا کہ اپنی زمینوں اور فصلوں سے باہر نکلا کریں۔ اوہ نہیں جی۔" اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "وہ کہتی تھیں کہ ان سے زیادہ اہم انسان ہوتے ہیں۔ اور ان زمینوں اور فصلوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے زندگی۔" وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا تھا۔

یہ شغل ہے کسی کا، نجانے کیا چاہے
نہ فاصلوں کو مٹائے نہ فیصلہ چاہے
میری بساط کیا ہے میں تو ہوں برگِ آوارہ
اڑا کے لے جائے مجھ کو جدھر ہوا چاہے

"اتنا لمبا سفر اور تنہا۔" اُس نے جوتے کی نوک سے سڑک پر پڑے کنکر کو ٹھوکر ماری۔

"اور ہم شاید آغاز ہی میں تھک گئے ہیں۔" اُس نے بہت دور تک جاتی تپتی سڑک پر ایک تھکی ہوئی نگاہ ڈالی۔

"جھوٹ کہتی تھیں شہلا اور زیبا۔ سمندروں جیسی گہری۔ بارش کے پہلے قطرے جیسی پاکیزہ۔ ایسی ہوتی ہیں محبتیں۔ انا پرست، خود غرض۔ اُس نے بھلا کہاں سیکھا ہوگا ہارنا۔ مگر ہم اُسے ہرانا کب چاہتے تھے۔ بس ایک بار کہہ دیتا ماہم رک جاؤ۔ ہم رک جاتے۔ مگر کیسا کٹھور تھا کہ۔"

"ماہم۔ ماہم۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس آیا تھا۔ اُس نے آنکھیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو اندر اُتارا مگر رُکی نہیں۔

"ماہم کہاں جا رہی ہو؟" (ہائے رے معصومیت)

"آپ کو کیا کہیں بھی جائیں۔" اُس نے بار بار سامنے آنے والی لٹ کو سختی سے بینڈ میں اڑسا۔

"اچھا رکو تو اتنی گرمی ہے۔ میں گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ایکدم سامنے آگیا۔ اُسے رُکنا پڑا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یہ احسان مت کریں ہماری ذات پر۔" اُس نے سائیڈ سے نکلنا

"یہ احسان تو نہیں۔" وہ دوبارہ سامنے آگیا۔ "راستہ چھوڑیں۔" وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ بولی۔

"تمہارا ہر رستہ تو مجھ تک آتا ہے۔" اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔

"ہمارا اور آپ کا رستہ ہمیشہ سے الگ ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"چلو رستے الگ سہی منزل تو ایک ہے۔" اُس کے چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔" اُس نے کترا کر نکلنا چاہا وہ پھر سامنے آگیا۔

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" اُسے غصہ آگیا۔ (اب وہ روک رہا ہے)

"محترمہ! آپ اپنا شولڈر بیگ گھر بھول آئی ہیں۔" اُس نے اچانک کہا۔ تو اُسے یاد آیا ساری رقم تو اسی بیگ میں ہے۔

"کرایہ دوں؟" اُس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

"مجھے آپ سے کچھ بھی نہیں لینا۔" وہ سائیڈ سے نکل گئی۔ تبھی جوتے کا نازک سا اسٹریپ نکل گیا۔ اور اُس نے بازو سے تھام کر اُسے گرنے سے بچایا تھا۔

"اب کیسے جائیں گی۔" اُس کی مسکراہٹ ماہم کو کچھ اور چڑا گئی۔

"ہم اب بھی جائیں گے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ دونوں جوتے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔ تپتی زمین پر پاؤں رکھتے ہی جیسے جان نکل گئی۔ مگر ضبط کر گئی۔

"اچھا چلو یہ سلیپر پہن لو۔" اُس نے اپنے سلیپر اُتارے۔

"خود غرض، انا پرست کٹھور۔" وہ زیرِ لب بڑبڑاتی آنکھوں میں در آنے والا پانی سختی سے دھکیلتی آگے بڑھ گئی۔

"محترمہ یہ اتنے سارے خطاب دے کر آپ جا کہاں رہی ہیں۔" وہ دوبارہ رستے میں کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے میں ہوں انا پرست۔ مگر محبتوں میں تو انا ہوتی ہی نہیں۔"

"کن محبتوں کی بات کر رہے ہیں آپ۔" وہ تنک کر بولی۔

"وہی۔ جو مجھے تم سے ہے۔" گمبھیر آواز کا جادو۔ وہ اُس کی طرف جھکتے ہوئے اُس کی بھیگی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ وہ بیگ پٹخ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

"یہ سب آپ گھر میں نہیں کہہ سکتے تھے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"ہاں کہہ تو سکتا تھا۔" وہ ندامت سے سر کھجاتا ہوا بولا۔ "مگر مجھے خوف تھا کہیں تم انکار نہ کر دو۔" اور خود ہی مفروضے قائم کرتے رہے۔"

اُس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"بس یار دیہاتی سا بندہ ہوں۔ کیا کرتا بس اظہار کا طریقہ ہی نہیں سوجھتا تھا۔ تم یہ تو پہنو۔ دیکھو پاؤں کیسے سرخ ہو گئے ہیں۔"

"آپ کے پاؤں بھی تو جلیں گے۔" وہ سلیپر پہنتے پہنتے معصومیت سے بولی۔

"محترمہ! یہ ایک کسان کے پاؤں ہیں۔" اُس نے سینے پر ہاتھ مار کر فخریہ لہجے میں کہا۔

جلتے سورج نے بھی یہ منظر بڑی حیرانی سے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے نازک سے پاؤں میں بڑے بڑے سلیپر گھسیٹتی جا رہی تھی، جس سے بار بار اُس کے پاؤں نکل جاتے تھے۔ اور اُس کے ساتھ وہ اونچا لمبا دیہاتی نوجوان اپنے ننگے پاؤں دھرتی کے سینے پر مضبوطی سے جمائے چلا جا رہا تھا۔ اور دونوں کے ہونٹوں پر الوہی سی مسکراہٹ اٹھی تھی۔